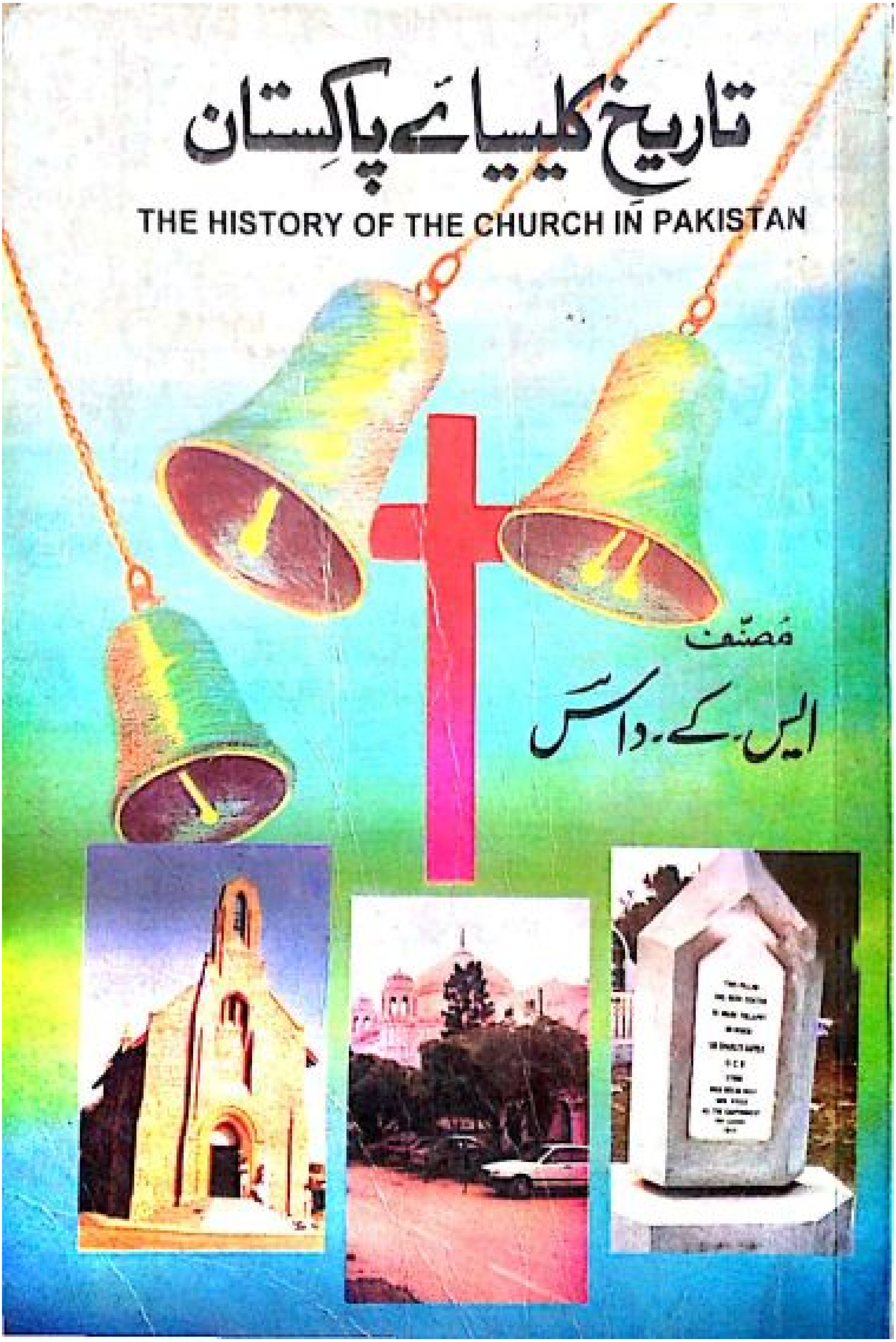

تاریخ کلیسائے پاکستان
THE HISTORY OF THE CHURCH IN PAKISTAN
مصنّف
ایس۔ کے۔ داس

مصنف
ایس۔ کے۔ داس
بشپ آف حیدرآباد



تاریخ کلیسیائے پاکستان

"تاریخ کلیسیائے پاکستان ایس کے داس کی تصنیف ہے۔ جو تقریباً ۲۰ سال کی تحقیق و مطالعہ پر مبنی ہے۔ مصنف آج کل حیدرآباد ڈایوسیس کے بشپ (دوم) ہیں۔ اس سے پیشتر وہ کیتھیڈرل ہائر سیکنڈری سکول لاہور کینٹ کے پرنسپل تھے۔

مصنف سندھ چرچ آف پاکستان کے جنرل سیکرٹری بھی رہے ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں پیغام خداوندی دینے کا شوق دامن گیر رہتا ہے۔ جنرل اور چرچ ہسٹری خاص مضامین ہیں جن سے انہیں خاصی دلچسپی ہے۔ باون (۵۲) ممالک میں جانے کا اتفاق ہو چکا ہے اور اسی سارے تجربہ اور علم کی وساطت سے مذکورہ کتاب تحریر کی ہے یہ کتاب مسیحیان پاکستان کا سرمایہ ہے۔ اسے سرگذشت ماضی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

مصنف کی یہ دلی خواہش ہے کہ حال و مستقبل کی نسل اس تحریر سے اس طرح استفادہ کرے کہ وہ زندہ قوم کی طرح زندگی بسر کرے اور ملک میں ایک تشخص قائم رکھ سکے۔

ملنے کا پتہ:
بشپ ہاؤس
27۔ لیاقت روڈ سول لائنز
حیدرآباد 71000 پاکستان
فون: 28836-780221 (0221)

تاریخِ کلیسیائے پاکستان

تُوما رسُول سے لے کر سانحہ شانتی نگر تک

مُصنّف

ایس۔ کے۔ داس

بشپ آف حیدرآباد

ماڈریٹر چرچ آف پاکستان

سابق پرنسپل کیتھیڈرل ہائر سیکنڈری سکول لاہور کینٹ

سابق پرنسپل سینٹ جانز ہائی سکول راولپنڈی

سابق کوارڈینیٹر لاہور ڈایوسیسن بورڈ آف ایجوکیشن

سابق جنرل سیکرٹری چرچ آف پاکستان

نام کتاب ________ تاریخ کلیسیائے پاکستان

مصنف ________ ایس۔ کے داس

پرنٹرز ________ یونائٹڈ پرنٹرز اینڈ سٹیشنرز مزنگ اڈہ لاہور

کمپوزنگ ________ سید گرافک 0333-4224011

ناشر ________ بشپ آف حیدرآباد

تعداد ________ ایک ہزار

پہلا ایڈیشن ________ ستمبر ۱۹۹۵ء

دوسرا ایڈیشن ________ اکتوبر ۱۹۹۵ء

تیسرا ایڈیشن ________ مارچ ۱۹۹۶ء

چوتھا ایڈیشن ________ اپریل ۱۹۹۸ء

پانچواں ایڈیشن (نظرثانی شدہ) ________ جون ۲۰۰۱ء

قیمت: ۶۵ روپے

ملنے کا پتہ

بشپ ہاؤس

27-لیاقت روڈ سول لائنز حیدرآباد 71000 پاکستان

اِنتساب

اپنے والدین اور بزرگ بھائی کے نام

والدین پادری و مسز خوب داس جنہوں نے ہندوستان میں اپنا آبائی دھرم ہندومت ترک کیا اور منجئی دو عالم یسوع المسیح کو قبول کیا اور باقی تمام عمر پاکستان میں پاسبانی خدمت میں گزار دی۔

برادرِ بزرگ ریورنڈ وِنسنٹ خوب داس علمِ الٰہیات کی تربیت حاصل کر کے لاہور۔ کراچی اور پھر لندن (میتھوڈسٹ چرچ ساؤتھ ہال) میں پاسبانی خدمت میں مصروف رہے۔ ۲۵ر فروری ۱۹۸۱ء کو حرکتِ قلب بند ہونے سے لندن ہی میں انتقال کر گئے۔

ان تینوں کی شفقت اور محبت کی تازگی ہمیشہ میرے دل کو سکون اور راحت پہنچاتی رہے گی۔

دیباچہ

اس کاوش میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمارا سلسلۂ بشارت بہت بہت قدیم ہے اور مسیح خداوند کے شاگردوں سے جا ملتا ہے۔ توما رسول پہلے پہل جب آئے تو پاکستان ہی کی سرزمین پر قدم رکھا اور اُس شہر میں آئے جو آج کل ٹیکسلا کہلاتا ہے۔ یہاں کلیسیاء قائم کر کے جنوبی ہندوستان کے مغربی ساحل مالابار چلے گئے اور سات کلیسیائیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد ازاں مشرقی ساحل کی طرف کورومنڈل کا رُخ کیا اور وہاں بھی کلیسیائیں قائم ہوتی گئیں۔ آخر مدراس میں بشارت کے کام میں مگن تھے کہ ایک کٹر ہندو نے کلہاڑے یا شاید نیزے سے آپ کو قتل کر دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اس طرح سلسلۂ بشارت اختتام کو پہنچ جائے گا۔ مگر اُس کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ کیونکہ یہ سلسلہ لامتناہی ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے موجودہ مسیحیوں کی تعداد اُس ہندو کی خام خیالی کا مذاق اُڑاتی ہے۔ آپ کا مزار آج بھی مائیلاپور (مدراس) میں موجود ہے۔

کتاب ہذا میں وہ تمام واقعات درج ہیں جو کلیسیائی ترقی و تنزل کے سلسلہ میں رونما ہوئے۔ تکالیف اور ایذا رسانی کا ذکر بھی مُفصّل طور پر کیا گیا ہے جن سے کلیسیا نبرد آزما رہی۔ نیز کلیسیا کن مراحل سے گزری۔ کلیسیا کی ترویج و ترقی کے سلسلہ میں انگریزی حکومت، چند انگریز افسران، پُرتگیز، فرانسیسی اور امریکن مشنریوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ دیسی لوگوں نے آخر میں شمولیت کی اور کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اور یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔

بشارت کا آغاز ہوا اور پاکستان چلا آیا۔ قارئین کو خیال رکھنا ہوگا کہ لفظ ''ہندوستان'' سے مُراد وہ خِطہ ہے جو ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بٹوارے سے پیشتر ہندوستان کہلاتا تھا۔جس میں پاکستان اور ہندوستان شامل تھے۔

اس کتاب کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ اس تحریری کاوش میں مسٹر یونس میسی ایم اے، بی ایڈ کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ کیونکہ اُنہوں نے پروف ریڈنگ میں میری بڑی معاونت کی۔ میں اسے احسان کے طور پر ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

یہ میری تقریباً بیس (۲۰) سالہ کوشش اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلہ میں بیشمار کتب، شخصیات، لائبریریوں، آثارِ قدیمہ، سرکاری عمارات اور بالخصوص پاکستان میں انگریزی دور کے بنائے ہوئے تمام گرجا گھر اور اُن کے اندر لکھی گئی عبارات شامل ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ اس میں طبع شدہ تصاویر بھی دلچسپی کا موجب بنیں گی۔ سن اور تاریخ کے سلسلہ میں نہایت ہی احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔

''گر قبول اُفتد زہے عز و شرف''

ایس۔ کے۔ داس

فہرست مضامین

تاریخِ کلیسیائے پاکستان

''قارئین کی نظر میں''

1- تقریباً اڑھائی سو صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب ''تاریخ کلیسیائے پاکستان'' اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ پاکستان میں مسیحیت کی ابتداء ۱۸۴۹ء میں برٹش راج سے ہوئی۔ کیونکہ ۱۸۵۰ء میں ''جان نیوٹن'' بحیثیت اوّل مشنری لاہور تشریف لائے تھے۔

روزنامہ (انگریزی) فرنٹیئر پوسٹ، لاہور

۱۸/نومبر ۱۹۹۵ء

2- لاہور کی معروف تعلیمی شخصیت ایس۔ کے۔ داس کا یہ دعویٰ کہ اُن کی تحریری کاوش تاریخ کلیسیائے پاکستان بیس (۲۰) سال کی تحقیق و مطالعہ پر مبنی ہے، میں ذرہ بھر مبالغہ محسوس نہیں ہوتا۔

روزنامہ پاکستان، لاہور

۱۱/جنوری ۱۹۹۶ء

اِبتدائے کلیسیا

عید پنتکست اور ارشادِ اعظم

ڈاکٹر بلی گراہم آجکل کی مسیحی دُنیا کے سب سے بڑے مُبلغ ہیں اور اُن کی شہرت چاردانگِ عالم میں ہے۔ مسیحی دُنیا کا کوئی شخص ان سے ناواقف نہیں۔ وہ دُنیا بھر کی جانی پہچانی اور مانی ہوئی شخصیت ہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ اپنی کروسیڈ میں فرمایا ''مسیحیت مذہب کا نام نہیں بلکہ یہ زندگی گزارنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔''

اس مقولہ سے یہ معنی اخذ ہوتے ہیں کہ ہم دُنیا سے الگ تھلگ ایک ایسا طریقۂ حیات اپنائے ہوئے ہیں جس سے ہماری زندگی بطور مسیحی دوسروں سے قطعی مختلف ہو جاتی ہے۔ ایماندار کی بابت خداوند نے فرمایا ''اِس جہان کے ہمشکل نہ ہو۔ بلکہ اپنے بدن سے اُس کا جلال ظاہر کرو اور اپنا بدن ایسی قربانی ہونے کے لئے نذر کرو جو زندہ پاک اور خدا کو پسندیدہ ہو۔ یہی تمہاری معقول عبادت (اور مذہب) ہے۔''

دُنیا کے فریب، حرص وطمع اور ہتھکنڈے ایماندار کے لیے پھندا ہیں۔ اسے ہر روز صلیب پر مصلوب ہونا اور آزمائشوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ہوسِ زر اور دُنیاداری اس کی روح کو مجروح کر دیں گے۔ خوفِ خداوندی اس کے رگ وپے میں سما جائے گا۔ ضمیر کی خلش اس میں خداوند سے دوری کا احساس پیدا کر دے گی۔ کیونکہ ایسے اطوار اسے زیب نہیں دیتے۔ مسیح خداوند زیتون کے پہاڑ سے صعود فرمانے سے قبل اپنے شاگردوں سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ یہی ارشادِ اعظم

ہے۔

''تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور انہیں باپ، بیٹے اور پاک روح کے نام سے بپتسمہ دو۔''

یہ ارشادِ اعظم یعنی انجیل کی منادی ہر شخص پر جو خداوند کے نام سے نامزد ہے اولین فرض ہونا چاہیے۔ تاکہ انجیل، جس کے لغوی معنی خوشخبری کے ہیں ہر انسانی زندگی کے لئے شادمانی کا باعث بنے۔ شادمانی و نجات پر لے جائے کیونکہ نجات ہی تو مسیحی مذہب کا طرۂ امتیاز ہے۔ نجات مسیح خداوند کے خون سے وابستہ ہے۔ نجات کا یہ دروازہ کسی پر بند نہیں۔ نجات دہندہ کا اقرار ہر کسی کو مستحق بنا کر شمولیت کا موقع فراہم کرتا ہے۔

شاگردوں نے حکمِ ربانی اپنایا اور اسے دنیا تک پہنچایا۔ مسیح خداوند کے صعود فرمانے کے بعد شاگرد یروشلیم میں ٹھہرے رہے۔ اور ایک جگہ جمع تھے کہ زور کی آندھی کا سناٹا ہوا۔ یہاں تک کہ سارا گھر گونج اٹھا۔ اس موقع پر انہوں نے آگ کے شعلہ کی سی پھٹتی ہوئی زبانیں دیکھیں۔ جو اُن پر آٹھہریں۔ اور وہ سب روح القدس سے بھر گئے اور غیر زبانیں بولنے لگے۔ خداوند سے تعلق رکھنے والے تو حیرت زدہ نہ ہوئے مگر دوسرے لوگ انگشت بدنداں تھے۔ ہر شخص جو لاتعلق ہوتا ہے یا اس حقیقت سے بے بہرہ ہے آج بھی حیران ہوتا ہے۔ کیونکہ نہیں جانتا کہ خداوند نے فرمایا ''تم روح القدس انعام میں پاؤ گے۔''

یہ واقعہ صعود سے دس روز بعد ظہور پذیر ہوا۔ اسے انجیلی پیغام میں عیدِ پنتکست کے موقع پر نزولِ روح القدس کا نام دیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب مختلف اقوام اور ممالک کے یہودی یروشلیم میں جمع تھے۔ شاگردوں کو بھی یروشلیم میں ٹھہرے رہنے کا حکم تھا۔ اور یہ کہ دوسرے مددگار کے منتظر رہیں۔ تمام شاگرد اور

نئے شاگرد متیاہ اور مقدس لوقا سمیت سب دوسرے مددگار سے ملبّس ہو کے گواہی اور تعمیل ارشادِ اعظم کے لئے پورے طور پر مستعد ہو گئے۔

یہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ گواہی کا آغاز یروشلیم ہی سے ہوا۔ پس جب شعلہ کی سی پھٹتی ہوئی زبانیں اتر آئیں اور ہر ایک پر آ ٹھہریں تو وقت نزول خدا ترس لوگوں کی ایک جماعت جمع تھی اور ہجوم میں مختلف لوگ تھے۔ یعنی پارتھی، مادی، عیلامی اور مسوپتامیہ، یہودیہ، کپدکیہ، پنطس، آسیہ، فروگیہ، پمفولیہ، مصر، لبوا، روم اور عرب کے رہنے والے تھے۔

پطرس نے روح سے معمور ہو کر ان سے کلام کیا۔ لکھا ہے کہ اُن کے دل پر چوٹ لگی۔ اور یہ لوگ جو ایران، ترکی، شام، عراق، فلسطین، ایشیائے کوچک، مصر، لبیا، یونان، روم، اور عرب کے باشندے تھے پطرس رسول کے وعظ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اُن کے دل پر چوٹ لگی۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے اور رسول کی زبانی سن بھی لیا تھا کہ سردار کاہنوں اور یہودیوں نے تو مسیح خداوند کو مصلوب کیا، مگر خدا نے اُسے زندہ کیا اور اس کی خالی قبر ان سب کی کرتوتوں کی غمازی کر رہی ہے۔ یہ قبر آج بھی ٹھیک حالت میں موجود ہے۔

زندہ اور سچا کلام اُن کے انگ انگ اور گودے گودے میں سرایت کر گیا اور انہوں نے رسولوں اور پطرس سے اس کا علاج دریافت کیا۔ اس ضمن میں رسولوں نے چار حقائق بیان کئے۔

۱۔ توبہ ۲۔ اقرار گناہ ۳۔ مسیح خداوند پر ایمان ۴۔ بپتسمہ۔ من اور تن کی کثافت دور کرنے کے لئے۔ یہ سنتے ہی تین ہزار آدمی مسیحیت میں شامل ہو گئے۔

یہاں پر مسیحیوں کی تعداد ۳۰۰۰ + ۱۲ رسول + وہ لوگ جو مسیح خداوند کی زمینی زندگی میں اُس پر ایمان لے آئے تھے۔ اس طرح تعداد ۳۵۰۰ کے قریب

ہو گئی۔

خداوند کا کلام ترقی کرتا اور پھیلتا گیا۔ یہ لوگ بپتسمہ پانے کے بعد اپنے اپنے وطن سدھارے اور مسیح خداوند کے نام کی گواہی دینے میں مشغول ہو گئے۔ بشارت کے سلسلہ میں یہ نہایت ضروری تھا کہ پہلے یروشلیم، یہودیہ، سامریہ اور پھر زمین کی انتہا تک خدا کا پیغام پہنچے۔ یروشلیم میں آغاز ہوا اور وہ بھی زبردست۔ یہ حقیقت ہے کہ اس آغاز میں یہ واحد اور پہلا موقع تھا جب سب شاگرد ایک ہی جگہ جمع تھے۔ اعمال ۶: ۷ میں یوں مرقوم ہے کہ

''خداوند کا کلام پھیلتا رہا اور یروشلیم میں شاگردوں کا شمار بہت ہی بڑھتا گیا اور کاہنوں کی بڑی گروہ اس دین کے تحت میں ہو گئی۔''

یہاں حیرانی کی یہ بات ہے کہ کاہن بھی مسیحیت کے حلقہ بگوش ہو گئے اور اعمال ۴: ۴ کے مطابق تعداد پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔

پطرس رسول شاگردوں کا لیڈر تھا۔ اور وہ بڑی دلیری، اختیار اور روح القدس کی بھرپوری سے حکومت، بااختیار لوگوں، سردار کاہنوں، فقیہوں اور عوام میں مسیح خداوند کے زندہ نام کی گواہی دے رہا تھا۔

اے بھائیو! میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ کام نادانی سے کیا اور ایسا ہی تمہارے سرداروں نے بھی۔ اعمال ۳: ۱۷۔ جہاں روح کی معموری نے بہت کام کیا تھا اور کلیسیا کی ابتدا بہت زبردست ہوئی تھی، وہاں مصائب کا آغاز بھی اتنا ہی شدید تھا۔ یہودی کاہنوں اور عوام نے ستفنس پر ہاتھ ڈالا اور اُسے شہر سے باہر لے جا کر سنگسار کیا۔ ستفنس کی شہادت نے مخالفین کے حوصلے بڑھا دیے، ظلم و جور کا بازار گرم ہو گیا۔ رسولوں کے سوا سب لوگ یہودیہ اور سامریہ کی اطراف میں پراگندہ ہو گئے۔ خداوند کی مرضی یہ تھی کہ بشارت کا دائرہ اور وسیع ہو جائے

اور ایسا ہو گیا۔ حالانکہ رسولوں کو ابھی کچھ اور وقت درکار تھا، کیونکہ یروشلیم اور یہودیہ میں انجیل جلیل کی منادی کرنی تھی۔ یہاں ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ:۔

کلیسیا کا شہیدِ اوّل

مسیحیت اور اذیتیں دو ہزار سالوں سے شانہ بشانہ چلی آ رہی ہیں۔ زندگی دکھوں سے عبارت ہے اور یوں زندگی نکھرتی ہے۔ اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ بعینہٖ مسیحیت ظلم و استبداد کی پروردہ ہے۔ حقیقتاً مسیحیت کا آغاز بھی دکھوں سے ہوا بلکہ اِس کا دوسرا نام دُکھ سہنا ہے۔ اس لئے یہ لازم و ملزوم بن کر رہ گئے ہیں۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ دُکھ تو مسیحیت کی پہچان ہیں۔ دُکھ نہیں تو کچھ نہیں۔ جس طرح آگ سونے کی چمک کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح دُکھ مسیحیت کے پھیلاؤ کا باعث بنے۔ اور آج دنیا میں مسیحیت پہلے نمبر پر ہے۔ شہیدوں کا خون کلیسیا کو تقویت دیتا رہا۔ خون بہتا اور پھیلتا رہا۔ یہاں تک کہ خونیوں نے بھی اپنے خون کا نذرانہ دینا شروع کر دیا۔ اور یہ پودا پاک روح کی مدد سے پروان چڑھتا رہا۔

عید پنتکست کے موقع پر جو لوگ شام، عراق، ایشیائے کوچک، عرب، یونان اور روم سے تشریف لائے تھے اور جب انہیں پطرس رسول کا وعظ سننے کا موقع میسر آیا تو اُن کے دل پر چوٹ لگی۔ اور دلی توبہ کی وجہ سے انہوں نے روح القدس کی نعمت حاصل کی۔ یہی لوگ پاک روح سے ملبس ہو کر اپنے اپنے ملک واپس لوٹے تو بشارتی کام میں لگ گئے۔ اُنہوں نے رسولوں کا رتبہ تو نہ پایا مگر اُن جیسے کام ضرور کئے۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ خداوند کا پیغام اور انجیل کی خوشخبری انہی کے وسیلہ پہلی بار پھیلی کیونکہ یہ روح القدس کے حصول کا نتیجہ ہے۔ جو زندگیوں

میں تحریک پیدا کرتا ہے اور تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ تبدیلی ظاہر کی بجائے باطن سے شروع ہوتی ہے۔ جب کثافتِ باطنی دُھل جاتی ہے تو اس کا نمایاں اثر صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس امر سے یہ ثابت ہوا کہ مسیح خداوند کے صعود فرمانے کے بعد سالِ اوّل میں انجیل کی بشارت ان تمام ممالک میں پہنچ چکی تھی۔ جو گہوارۂ تہذیب تسلیم کیئے جاتے تھے۔ بے شک ان میں ہندو پاک اور چین شامل نہیں تھے۔ یہ بشارت کتنی موثر اور دُور رس تھی۔ تاریخ اس راز سے پردہ اُٹھانے سے قاصر دکھائی دیتی ہے۔

ایک باقاعدہ اور موثر بشارت اُس وقت سامنے آئی جب خداوند کے بارہ رسول یہودیہ اور سامریہ سے باہر آئے۔ ان میں سے پطرس رسول شام اور پھر روم میں، مرقس (پطرس کا شاگرد) سکندریہ مصر میں، یوحنا رسول ایشیائے کوچک میں بعد میں پولس رسول۔۔۔ کریتے، قبرص، یونان اور روم تک چلے گئے۔ برتلمائی یمن اور عربستان میں پہنچا۔

چرچ ہسٹری میں شواہد موجود ہیں کہ قسطنطین اعظم[1] کے وقت تھیفلس (۳۵۴ء میں) ایک جزیرہ نماد یوس (سقوطرہ) کا باشندہ تھا۔ اور بطور یرغمال رومی حکومت میں لایا گیا تھا۔ اسی تھیفلس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہی بشپ تھا جو یمن میں آیا۔ یہاں تین گرجا گھر بنانے کا سہرا اُس کے سر تھا۔ یمن کے یہودیوں نے مخالفت کی انتہا کر دی مگر چونکہ یہ کام خداوند کی طرف سے تھا اس لیے یہ کامیاب و کامران رہا۔ اسی کی منادی کا نتیجہ تھا کہ حاکم یمن نے مسیحیت کو قبول کر لیا۔ جس طرح چھلنی میں پانی نہیں ٹھہر سکتا بالکل اسی طرح خداوند کے بندوں کے اندر گواہی نہیں رُک سکتی۔ کیونکہ تھیفلس ان علاقوں کو چھوڑ کر دیوس (سقوطرہ) چلے

---

1 رسولوں کے نقشِ قدم پر۔ ولیم جی ینگ (مسیحی اشاعت خانہ لاہور) صفحہ نمبر ۵۲

گئے۔ اگر دیوں ہی سقوطرہ تھا تو اس جزیرہ میں بھی مسیحی تبلیغ تھیئلس ہی نے کی۔ اس کے بعد اُس کے قدم حبش کی طرف بڑھ گئے۔

رسولوں کے کام کو ترقی دینے والے وہ مبلغین تھے جو تھیئلس کے بعد یہاں آئے اور بشارت کا کام اور بھی ترقی کرتا گیا۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ حیران کن باتوں کا جن سے وہ خود متاثر ہوا ہوتا ہے۔ ذکر ضرور کرتا ہے۔ مسیحیت کا پرچار اُن لوگوں نے جو عید پنتکست کے دن موجود تھے اپنے اپنے ملک میں جا کر کیا اور رسولوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے مسیحیت وہاں پہنچ گئی اور لوگوں میں اشتیاق پیدا ہوا کہ ہم یہ باتیں کسی رسول کے دہن مبارک سے سُنیں۔

اعمال ۲: ۱-۱۲ کا مطالعہ اِس حقیقت کا اظہار و ثبوت ہے کیونکہ یہ پارتھی، مادی، عیلامی، مسوپتامیہ اور فارس کی سلطنت سے تعلق رکھتے تھے۔ یہودیہ، کپدکیہ، پنطس، آسیہ، فروگیہ اور پمفولیہ کے علاقے، ایشیائے کوچک سے متعلق تھے۔ مصر اور لیوایہ اعظم افریقہ میں شامل تھے۔ رومی اور کریتی یورپ سے تھے۔ اور عرب کا ذکر ان سب سے بعد میں آیا ہے۔ گواہی اور بشارت کے سلسلہ میں اُن تین ہزار لوگوں نے اپنے ملکوں میں زمین تیار کی ہوگی۔ پھر رسولوں کا ورود کلیسیائی تنظیموں کا سبب بن گیا۔

توما رسول کی بابت یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے لئے سکندریہ سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ اور اس سے قبل کہ وہ سرزمین ہندوستان پر قدم رکھتے راستے میں مصر کے مسیحیوں سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ اور یہ بات ثبوت فراہم کرتی ہے کہ مقدس مرقس کی کلیسیا کے ایک مورخ یوسیبوس[1] کے مطابق وہ ۴۳ء میں اسکندریہ پہنچا اور اُس نے اپنی منادی کا آغاز کیا جو مقدس توما کے اسکندریہ پہنچنے سے تقریباً

---

[1] مقدس توما۔ ایس۔ این۔ والڈ (ایس۔ وی۔ ڈی) کاتھولک ادارہ دینیات پاکستان، صفحہ نمبر ۱۰۷

باب دوم

ٹیکسلا پہلی صدی عیسوی میں

یہاں تین باتوں کو مد نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اولاً یہ مقدس توما کے ہندوستان آنے سے قبل اور یہاں پہنچنے پر یہاں کی سیاسی حالت کن مراحل سے دوچار تھی۔ کون سے بادشاہ حکومت کرتے تھے اور کن مذاہب سے وابستہ تھے۔

دوم۔ وقت مذکورہ کی تاریخ کا بیان کرنا اور کلیسیائی حالت کے ساتھ مطابقت کرنا تمام واقعات کے سمجھنے میں بہت آسانی پیدا کرتا ہے۔

سوم۔ پاکستانی کلیسیا کی تاریخ صرف پاکستان کے قیام پذیر ہونے ہی سے شروع نہیں ہوتی بلکہ اس کا جوڑ اور تعلق برطانوی، مغلیہ سلاطین دہلی، ہندو اور بدھ مت کے ادوار کے ساتھ منسلک کرنا واجب التسلیم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مسیحیت کا سراغ مقدس توما کی آمد تک آسانی سے مل جاتا ہے۔ اور چونکہ ان کی آمد کا تعلق ٹیکسلا سے ہے اور یہ معروف شہر پاکستان کا خاص حصہ ہے اس لئے ٹیکسلا اور مقدس توما کے ذکر کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ذکر موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ اس شہر کو اگر برصغیر میں مسیحیت کی جنم بھومی کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ٹیکسلا

ان دنوں ٹیکسلا قندھار کا دارالخلافہ تھا۔ اس کے لغوی معنی ہیں تراشیدہ پتھروں کا شہر۔ شاہراہ پشاور کے دائیں جانب راولپنڈی سے تقریباً بیس میل یا تیس کلومیٹر دور صوبہ پنجاب کا مشہور شہر ٹیکسلا ہے جہاں آجکل پریسبٹیرین چرچ کا آنکھوں کا ہسپتال واقع ہے۔

الف :۔ ۵۱۵ ۔ ق ۔ م میں فارس کے بادشاہ نے قندھار پر یلغار کی اور بزورِ شمشیر ٹیکسلا کو اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا۔ یہ اُس کی سلطنت کا بیسواں صوبہ بن گیا۔ معاشی لحاظ سے بہت مالدار تھا۔ فارس کا بادشاہ اپنا مالیہ سونے اور چاندی کی شکل میں وصول کرتا تھا۔ یہ بادشاہ مذہبا زرتشت تھا۔ یعنی یہ لوگ آتش پرست تھے اور آگ کی پوجا کیا کرتے تھے۔ مذکورہ شہر کے باسی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اثر اتنا گہرا تھا کہ یہاں زرتشت لوگوں نے عظیم مندر تعمیر کر لیے جن کے آثار ابھی تک ان لوگوں کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اُن کے ماضی کی داستان زبانِ حال سے بیان کر رہے ہیں۔ یہ عظیم مندر اُن کی عظمتِ رفتہ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ب :۔ زرتشتی ہر چیز سے بے نیاز اپنے ماحول میں مست زندگی کی رنگینیوں سے محظوظ ہو رہے تھے کہ سکندرِ اعظم فاتح ہندوستان (جس کا نعم البدل بعد میں کوئی ملک نہ پیدا کر سکا) نے یہاں قدم نکالے۔ وہ ۳۲۶ ۔ ق ۔ م میں خیبر کے راستے اس علاقہ میں داخل ہوا۔ دریائے سندھ کو اٹک کے مقام پر سے عبور کیا اور ٹیکسلا کے دلکش اور پتھریلے علاقہ میں قدم رکھا۔ راجا امبھی نے اپنے آپ کو کمزور خیال کرتے ہوئے اور سکندرِ اعظم کی طاقت سے مرعوب ہو کر اُس کا مقابلہ نہ کرنا چاہا۔ اُس نے اپنی بساط کے مطابق انعام و اکرام اُس کے سامنے پیش کر کے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس سیاسی دوستی میں اُس کا بہت بڑا مقصد پوشیدہ تھا۔ دراصل وہ اپنے قریبی راجا پورس سے بدلہ لینے کا متمنی تھا۔ ورنہ وہ ہرگز اتنی خطیر رقم اور نقد سکندرِ اعظم کی نذر نہ کرتا۔ وہ از خود اُس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اُسے اچھا موقع میسر آیا۔ وہ ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ پورس ایک بہادر راجا تھا۔ اُس کی بہادری کا ثبوت سکندر جیسے بے مثل جرنیل سے بھڑ جانا تھا۔ راجا امبھی ہی نے سکندرِ اعظم کو جہلم پار

راجا پورس پر حملے کی ترغیب دی تھی۔ پورس وہ راجا تھا جسے ہندوستان کا ہیرو کہنا مناسب ہے۔ وہ اتنا قد آور تھا کہ سکندر اعظم کو بھی اس شخصیت نے متاثر کیا تھا، جس کی بدولت اُس نے اُسے اُس کا علاقہ واپس کیا تھا۔ مقام افسوس ہے کہ اس جنگ نے اُسے بیٹے سے محروم کر دیا۔ اور جب اُسے پابہ زنجیر سکندر اعظم کے روبرو پیش کیا گیا تو سکندر نے اپنی عظمت کو قائم رکھا۔ پوچھا "تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔" تو پورس نے جو بہادری کا سپوت تھا کہا "جو سلوک ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے۔" سکندر اُس کی حاضر جوابی سے بہت محظوظ ہوا اور اپنی خوشی کا ثبوت علاقہ واپس کر کے دے دیا۔[1]

سکندر اعظم کے ہمراہ آنے والے یونانی مورخوں نے ٹیکسلا کے باشندوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ اس ٹیکسلا شہر کی بہت تعریف کی اور اسے عالیشان شہر کے نام سے موسوم کیا۔

ج:۔ سکندر اعظم کے اپنے وطن کوچ کر جانے کے بعد پاٹلی پتر (پٹنہ) کے راجا چندر گپت موریہ نے ٹیکسلا کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ بعد ازاں وہ افغانستان تک بڑھتا چلا گیا۔ اشوک چندر گپت کا پوتا تھا جس نے ۲۷۳ سے ۲۳۲ ق۔م تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اس کو بڑی عظمت نصیب ہوئی۔ یہی راجا تھا جس نے شہنشاہ کہلانا پسند کیا۔ یہ موریہ خاندان کا سب سے مشہور زمانہ بادشاہ تھا۔ اُس کے زمانہ کو سنہری دور گنا گیا۔ اس کی اعلیٰ حکومت نے موریہ خاندان کے نام کو چار چاند لگا دیے۔ رعایا اُس کے زمانہ میں گھی کے چراغ جلاتی تھی یعنی خوش و خرم زندگی بسر کرتی تھی۔

اس نے بدھ مت کی اشاعت میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ موجودہ ٹیکسلا

---

[1] تاریخ کاروانِ ہند۔ کرشن گوپی، سکندر اعظم ۱۹۳۲ء

اُس کے وقت کی گواہی اپنے اندر موجود آثار قدیمہ سے دے رہا ہے۔ گوتم بدھ کے
بت سارے ہندوستان میں اُسی وقت کی خاص یادگار سمجھے گئے اور سمجھے جاتے رہیں
گے۔ اشوک کے دور کے بعد ۱۲۸ ق۔م میں پادر یہ ذات کے راجا نے ٹیکسلا پر
حکمرانی کی۔

مقدس توما کی آمد کے وقت ٹیکسلا میں سنسکرت، یونانی، فارسی، پادر یہ
زبانیں بولی جاتی تھیں۔ نیز جین مت، بدھ مت، پارسی اور یہودی مذہب بھی
پائے جاتے تھے۔ بڑے بڑے مندروں کے آثار اس حقیقت کا ثبوت ہیں۔ مختلف
کتب کے مطالعہ سے حیرت ہوتی ہے کہ ٹیکسلا میں یہودی بھی تھوڑی تعداد میں
موجود تھے۔ مقدس توما کی مادری زبان ارامی بھی بولی جاتی تھی جو یہودیوں میں
رائج تھی۔ یہی خداوند یسوع مسیح کی بھی مادری زبان تھی۔

یونانی زبان دُنیا میں اکثر بولی اور سمجھی جاتی تھی کیونکہ یونانیوں نے اپنے
تہذیب و تمدن کو دُنیا کو فتح کرنے کے ساتھ ساتھ متعارف کروایا۔ تاریخ کی ورق
گردانی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سکندر کے حملہ سے اس وطن کے باشندوں کو
ایک خاص فائدہ بھی پہنچا۔

ا:۔ یورپ اور ہندوستان کے درمیان بری اور بحری راستے کُھل گئے۔

ب:۔ دونوں براعظموں کے درمیان تجارت شروع ہوگئی۔

ج:۔ یونانی تہذیب کو متعارف کروایا گیا۔ اعلیٰ قسم کے سکے ڈھالے گئے۔ یہ فن
ہندوستانیوں نے دراصل یونانیوں ہی سے سیکھا۔

د:۔ یونانی فنِ بت گری میں بہت ماہر تھے۔ یہ آرٹ ہندوستانیوں میں اس حد تک
رواج پا گیا کہ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ یونانی بت گری کو مات دے دی تو کچھ بے
جا نہیں کیونکہ جب اشوک کے دورِ حکومت میں گوتم بدھ کے مجسمے ڈھالے گئے تو تیز

کرنا مشکل تھا کہ یہ یونانی ساخت ہے یا ہندوستانی۔ اسی وقت کے مجسمے ٹیکسلا میں کھدائی کے وقت ملے ہیں بلکہ آج بھی ٹیکسلا کے اور دُنیا کے عجائب گھروں میں سنگ تراشی کے نمونہ جات اپنے وقت کی داستان بتا رہے ہیں۔

تاریخ دانوں کو سکندر اعظم کے حملہ سے زبردست فائدہ ہوا کہ دُنیا اصل سن اور تاریخ کو جاننے لگ گئی۔

سکندر اعظم کے ساتھ بہت سے یونانی مورخ اور تاریخ دان تھے جنہوں نے حالات کو ساتھ ساتھ قلمبند کیا اور اُن کی تحریر سے ہندوستان میں تاریخ نویسی کو بڑی مدد ملی۔

ان ہی مورخین میں سے ایک ٹیکسلا کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ٹیکسلا ایک خوبصورت اور دلفریب شہر ہے۔ تراشیدہ پتھروں کا بنا ہوا شہر۔ ایک چشمہ بھی اس کی خوبصورتی کا باعث ہے۔ آس پاس پہاڑی علاقہ ہے۔ سرکاپ میں جو ٹیکسلا کا خاص حصہ ہے ایک یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ حصول تعلیم کے سلسلہ میں دور دراز سے لوگ کٹھن راہوں کو عبور کر کے یہاں آتے ہیں۔ اس میں مستعمل زبان سنسکرت ہے۔ راجوں، مہاراجوں، راجکماروں اور پنڈتوں کے بیٹے تعلیمی خواہش کی تکمیل کے لئے ٹیکسلا کا رُخ کیا کرتے ہیں۔ اس یونیورسٹی کو ہندوستان بھر میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ماحول صاف ستھرا ہے۔ یہاں پر علم نجوم، ریاضی، سنگ تراشی، ہیئت و فلسفہ اور دیگر مختلف علوم سکھائے اور پڑھائے جاتے ہیں۔

۱۹۳۵ء میں جب ایک انگریز افسر جان مارشل نے جو آثار قدیمہ میں بہت دلچسپی رکھتا تھا کھدائی کا حکم دیا تو پرانا ٹیکسلا عیاں ہو کر سامنے آ گیا۔ کشادہ سڑکیں، صاف اور روشندانوں والے مکان، بڑے بڑے دروازے، خاص طرز

تعمیر کا منفرد نمونہ۔ یہ عمارات اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور انسان دور قدیم کا دور جدید سے موازنہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ فطری امر ہے کہ انسان سوچتا ہے کہ وقتِ رفتہ کے باسی فہم و فراست اور کاریگری میں کسی سے کم نہ تھے۔ اگر نظرِ تحقیق سے دیکھا جائے تو اس وقت کا فنِ تعمیر آج کے فنِ تعمیر سے کسی طرح کم نہیں۔ جبکہ انسان مشینی دور میں داخل نہ ہوا تھا۔ کیونکہ موجودہ دور میں فنِ تعمیر اور فنِ حرب کے آلات قدیم دور سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔

عورتیں سونے چاندی کے زیورات سے آراستہ ہوتی تھیں۔ کھدائی کرنے پر جو زیورات اور سکے دستیاب ہوئے وہ آج بھی ٹیکسلا عجائب گھر کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ گوتم بدھ کی مورتی کو مراقبہ کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔ بدھ کی ہزارہا مورتیاں ہاتھ لگی ہیں۔ تواریخی لحاظ سے یہ بُت اشوک اور کنشک کے زمانہ کے ڈھالے ہوئے ہیں۔ مذکورہ راجے بدھ مت کے پیروکار تھے۔ اشوک کا زمانہ ۲۶۳ تا ۲۳۲ ق۔م تھا۔

کھدائی سے پتہ چلتا ہے کہ یونیورسٹی کے ساتھ چند ایک کالج اور سکول بھی قائم کیے گئے تھے۔ قصہ کوتاہ ٹیکسلا علم کا گہوارہ اور ایسی علمی درسگاہ تھی جو عظیم تصور کی جاتی تھی۔

۱۹۳۵ء کی کھدائی کا حاصل کلیسیائے پاکستان کا سرمایہ وہ صلیب ہے جو ایک کسان کو ہل چلاتے ملی تھی۔ وہ آج کیتھیڈرل چرچ، مال روڈ، لاہور میں نصب ہے۔

توما رسول کی آمد

دو ہزار سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے باعث بعض لوگ توما رسول کی ہند میں آمد کو ایک مفروضہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن شواہد، حقائق اور تاریخ کی روشنی میں یہ بات حقیقت کا روپ دھار لیتی ہے کہ یہ توما رسول ہی تھے جو ہندوستان آئے اور یہاں پر شہید ہوئے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول ہند کس سن میں تشریف لائے۔ تاریخ دان اس بات پر متفق ہیں کہ مقدس توما ۴۸ء میں ٹیکسلا آئے اور پھر سندھ میں سے ہوتے ہوئے سقوطرہ اور بعد میں مالا بار ساحل پر ۵۲ء میں جا نکلے اور بشارتی کام میں منہمک ہو گئے۔

توما رسول کو بائبل مقدس میں توام کہا گیا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ وہ اور اُن کی بہن توام پیدا ہوئے تھے۔ آپ بیت صیدا کے باشندہ تھے۔ بیت صیدا کے معنی ہیں مچھلیوں کا گھر۔ اُن کا آبائی پیشہ بڑھئی تھا اور وہ اعلیٰ پایہ کے نجار یعنی بڑھئی تھے۔

ایک دن اُن کا گذر جھیل کے کنارے ہوا اور مالکِ خیات یسوع سے ملاقات ہو گئی۔ خداوند نے توما کو اپنے پیچھے آنے کی دعوت دی جو بمسرت تمام قبول کر لی گئی۔ خداوند کے یہ الفاظ سن کر کہ میں تجھے آدم گیر بناؤں گا توما اس قدر خوش ہوئے جیسے بیش قیمت خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ ہر مخالفت سے بے نیاز ہو کر اُنہوں نے اپنے آپ کو منجی دو عالم کے قدموں میں ڈال دیا اور اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ دل کے گوشہ سے آواز آتی ہے کہ توما کتنی عمر کے ہوں گے جب انہیں دعوت دی گئی۔ اس سلسلہ میں وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اندازہ ہے کہ وہ تیس یا پینتیس برس کے لگ بھگ تھے۔

الف۔ توما رسول کو ایک نہایت دلیر رسول کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جب بیت

عنیاہ میں لعزر کی موت کے متعلق سنا تو ہمدردی اور جذبۂ محبت کا یوں اظہار کیا کہ
"آؤ ہم بھی چلیں تا کہ اُس کے ساتھ مریں۔"

ب۔ رسولِ ہند کو شکی رسول کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ نام بے جا نہیں۔ یہ حقیقت پر مبنی ہے کیونکہ جب خُداوند موت اور قبر پر غالب آ کر جی اُٹھے اور رسولوں پر ظاہر ہوئے تو ایک ظہور کے وقت مُقدس توما باقی رسولوں کے ہمراہ نہ تھے۔ اِس واقعہ کے انکشاف پر آپ نے اصرار کیا کہ جب تک میں اپنی اُنگلی مسیح خُداوند کے زخموں میں نہ ڈال لوں ہرگز یقین نہ کروں گا اور آخر جب مسیح خُداوند کا دیدار حاصل ہُوا، زخموں کو دیکھ لیا تو مسیح خُداوند کو موت اور قبر کا فاتح مان لیا۔ اِس شک اور یقین کا آنے والی نسلوں کو یہ فائدہ ہوا کہ خُداوند کے جی اُٹھنے کا کوئی وہم وگمان باقی نہ رہا۔ کیونکہ وہی مسیحِ مصلوب زخمی وگھائل مُقدس توما کے سامنے کھڑا تھا۔ جسے رسولِ ہند بذاتِ خود زخموں سمیت دیکھنے کا متمنی تھا۔

ج۔ تیسری بار ہم مُقدس توما کو گلیل کے پہاڑ پر دیگر رسولوں کے ساتھ دیکھتے ہیں جب مسیح خُداوند آن کی آن میں بادلوں پر اُٹھائے گئے۔ بادلوں نے مالکِ حیات کو اُن کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ شاگردوں کا جوش وخروش دیکھنے کے قابل تھا۔ خُداوند کی آمد کے لئے اُن میں جو تڑپ تھی وہ اُن کی خوشی کا اظہار تھا۔

اُس وقت توما رسول نے خود مسیح یسوع کا ارشادِ اعظم سُن لیا کہ تم ساری دُنیا میں جاؤ اور اُنہیں باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام پر بپتسمہ دو۔ تسلّی کا انداز لاجواب تھا۔ "دیکھو میں دُنیا کے آخر تک تمہارے ساتھ ہوں۔"

توما رسول نے ارشادِ اعظم کو خوب یاد رکھا کیونکہ جب آواز آئی کہ تُو ہندوستان جا تو وہ فلسطین جیسی ارضِ مُقدس کو چھوڑ کر ہندوستان کی طرف نکل کھڑا

ہوا جبکہ وہ علاقہ ہندوستان سے اتنا دور تھا جیسے پورب پچھم سے۔ سفر دشوار
گزار، ذرائع آمدورفت نہ ہونے کے برابر۔ رسول نے خداوند کے حکم کے
سامنے سر جھکا دیا۔

مسیح خداوند کے ارشاد کی تعمیل کے لیے تمام شاگرد جہاں روح القدس
نے انہیں اُبھارا چل دیئے۔ مقدس پطرس اٹلی گئے، مقدس مرقس مصر، مقدس لوقا
یونان، مقدس اندریاس اخیہ اور یوحنا رسول ایشیائے کوچک چلے گئے۔ توما رسول
کے حصہ میں ہندوستان آیا۔ رسول نے انکار کرتے ہوئے فرمایا ''میں ضعیف العمر
ہوں۔ کمزوری کے باعث طویل سفر مشکل ہوگا۔ سوائے ارامی کے اور کچھ بولنا
میرے لیے مشکل ہے''۔ لیکن مسیح خداوند نے خواب میں دکھائی دے کو واضح کردیا
کہ اُسے ہر حال میں ہندوستان جانا ہوگا۔

اُنہی دنوں میں ٹیکسلا کے راجا گونڈوفرس نے ہبن نامی ایک تاجر سے کہا
کہ وہ ایک بہت عالیشان محل تعمیر کرنا چاہتا ہے اور اس خواب کی تعبیر کے لئے اُسے
ایک زبردست کاریگر کی ضرورت ہے جو لکڑی کے فن میں یکتا ہو اور فن تعمیر میں
اُس کا کوئی ثانی نہ ہو۔ جب ہبن نامی تاجر فلسطین پہنچا تو اُس کی ملاقات توما رسول
سے ہوگئی۔ اسی نے اُسے ہندوستان چلنے کے لیے کہا۔ توما پہلے ہی ہندوستان جانے
کی بابت غور کر رہے تھے۔ اُنہیں یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اُن کا دل بلیوں اچھلنے
لگا کہ خداوند کا حکم پورا ہونے کو ہے۔ رسول کو یقین ہوگیا کہ یہ انتظام میرے
خداوند نے کیا ہے۔ دونوں ہندوستان جانے کیلئے تیاری کرنے لگے۔ رسول نے
اپنا ضروری سامان اپنے ساتھ لے لیا اور ہبن کے ساتھ ایک بادبانی جہاز پر سوار
ہوکر اسکندریہ کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے۔ آپ نے ہبن پر یہ واضح کردیا تھا کہ
میں مستول، چپوار، جہاز اور مندر بنانے میں ماہر ہوں۔ اور فن تعمیر سے میرا گہرا واسطہ

ہے۔

ان دنوں ملک روم اور بھارت کے درمیان تجارتی تعلق میں خاصی پیش رفت ہو چکی تھی۔ سیاہ مرچ، سوتی کپڑا، گرم مسالے، ہیرے جواہرات کی روم میں بڑی مانگ تھی۔ اکثر تجارت اسکندریہ سے نیل ندی اور پھر لال دریا سے ہندوستان تک جاری رکھی جاتی تھی۔ توما اور اس کے ساتھی ہبن نے بھی یہی راستہ اختیار کیا۔ وہ پہلے عدن پہنچے پھر سقوطرہ ہوتے ہوئے ہندوستان میں سندھ ندی پر پہنچ گئے۔ یہاں سے سندھ ندی سے اٹک اور اٹک سے پاپیادہ ٹیکسلا پہنچے۔ جو اٹک سے تقریباً چالیس میل دور تھا۔ اور یہی اُن کی منزل تھی۔ رسول کا جذبہ قابل تحسین تھا کیونکہ اگر اُن دنوں کے سفر کی دشواریوں کو سامنے رکھا جائے تو رسول کا ایمانی جذبہ نکھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ منزل کو سامنے دیکھ کر رسول پھولے نہ سمائے ہوں گے۔ اور یقیناً انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا ہوگا۔ اُسوقت ٹیکسلا میں راجا گونڈوفرس حکومت کرتا تھا اور یہی دارالخلافہ بھی تھا۔ ٹیکسلا قندھار کا دارالخلافہ تھا۔ اور گونڈوفرس کو گودوفرس بھی کہا جاتا تھا۔ جاد اسی کا بھائی تھا۔

غیر ملک میں اپنے ہم وطنوں کا مل جانا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ اُن دنوں ٹیکسلا میں چند یہودی بھی تھے جو شاید حصول علم کی خاطر آئے تھے یا پھر تجارت پیشہ تھے۔ مقدس توما پہنچتے ہی پہلے اُن کے پاس گئے اور انہیں یسوع ناصری کے بارے میں بتایا کہ وہ مالک حیات ہے۔ اُس کے بارہ رسول ہیں۔ اُن میں سے ایک میں ہوں۔ یہودیوں نے اُسے مصلوب کر دیا مگر وہ اپنی قدرت سے تیسرے روز جی اُٹھا اور ثابت کر دیا کہ میں دنیا کا نجات دہندہ ہوں۔

اُنہوں نے یہ ساری باتیں غور سے سُنیں مگر اُن کا یقین نہ کیا کیونکہ ایسا پہلے نہ کبھی ہوا تھا اور نہ ہی ایسا واقعہ سُننے میں آیا تھا۔ اس لیے اُنہوں نے اس

حقیقت کو رسول کی دماغی خرابی قرار دیا اور ایمان لانا ضروری نہ سمجھا۔ توما رسول نے سوچا کہ اس حقیقت کو کہ خدا یہودیوں میں ظاہر ہوا اور نجات دینے والا ہے تین قوموں یعنی پارسی، جین مت، بدھ مت اور یہاں کے سادہ لوح علما میں پیش کروں۔

راجہ گونڈوفرس اور توما رسول

توما رسول نے ۴۸ء میں ٹیکسلا میں قدم رکھا۔

تاجر حبن نے رسول کو یہاں کی خوب سیر کرائی۔ چار سال گزرنے کے بعد ۵۲ء میں توما جنوبی ہندوستان تشریف لے گئے۔ مقدس توما نے سیاحت کے دوران محیر العقول عمارات دیکھیں اور جب حبن نے بادشاہ سے ملاقات کرائی تو اُن کی بابت معلومات بہم پہنچائیں۔ بادشاہ پہلی نظر میں رسول کا گرویدہ ہو گیا۔ دورانِ گفتگو بادشاہ کی نظریں بار بار رسول کے جاذبِ نظر چہرہ پر جا رُکتیں۔ دورانِ سفر تکالیف کا تذکرہ ہوا۔ بادشاہ نہایت انہماک سے محو گفتگو رہا اور جب رسول شامل گفتگو ہوتے تو وہ رسول کی پُر تاثیر باتوں سے نہ صرف محظوظ ہوتا بلکہ انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتا۔ اُس کی دلی تمنا یہ تھی کہ رسول یونہی باتیں کرتا رہے اور میں سنتا رہوں۔ بادشاہ جس چیز سے زیادہ متاثر ہوا۔ وہ تھی رسول کی شخصیت اور اُس کا دھیما و لطیف لہجہ۔ صاف ظاہر تھا کہ بادشاہ کو ایسے شخص سے ملنے کا پہلی بار اتفاق ہوا ہے۔ راجا نے اپنی دلی تمنا کا اظہار کیا کہ میری یہ دیرینہ خواہش ہے کہ ایک عالی شان محل تعمیر کروں۔ یہ راجا سراپا دنیاوی انسان تھا۔ وہ آخرت کے بھید سے اور عارضی محل کی بجائے بہشتی زندگی سے قطعاً ناواقف تھا۔ اسی لیے اُس نے رسول سے ایک ایسی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ایسا محل بنائے جس کی نظیر ملنی مشکل ہو۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مقدس توما کو ایک خطیر رقم نذر کی گئی۔

مقدس توما جس عہدہ پر فائز تھے۔ وہ اپنی دلی کیفیت کی بنا پر آسمان پر محل تعمیر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے جس کی بابت باشندگانِ ٹیکسلا قطعی ناواقف تھے۔ انہوں نے سارا روپیہ غریبوں، تیموں اور لاوارث لوگوں میں تقسیم کر دیا اور انہیں نجات دہندہ کی خوشخبری بھی دی۔

رسول راجدھانی سے دُور اپنے روحانی کاموں میں زیادہ مگن رہتے۔ ایک دن اچانک محل کی تعمیر کے بارے میں مقدس توما سے بازپرس کی گئی۔ (کیونکہ بادشاہ سے شکایت کی گئی تھی کہ اِس بزرگ نے ابھی تک دیئے گئے کام کی طرف توجہ ہی نہیں کی۔)

آپ نے بازپرس کی جواب میں کہا تا حال دیواریں کھڑی ہوئی ہیں اور چھت ڈالنے کا کام باقی ہے۔ راجا کو آگاہ کیا گیا کہ یہ آدمی بظاہر نیک اطوار دکھائی دیتا ہے۔ درحقیقت یہ نہایت عیار اور مکار ہے۔ اِس نے محل کا تعیری کام بالکل انجام نہیں دیا اور تمام روپیہ غرباء میں تقسیم کر دیا ہے۔ اِس کا رابطہ صرف غریبوں اور حاجتمندوں سے ہے۔ بدروحوں کو نکالنا اور معجزات کرنا اِس کا کام ہے۔ دراصل یہ تعمیر کے کام سے قطعی نابلد ہے۔ سادہ خوراک کھاتا ہے اور کسی مشروب کو مُنہ تک نہیں لگاتا۔ عبادات کے لحاظ سے مہاتما معلوم ہوتا ہے۔ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا معیوب جانتا ہے۔ اِن کے جسم پر جب سے آیا ہے ایک ہی لباس دیکھنے میں آیا ہے۔ اِن کے سارے کے سارے کام دنیا سے الگ اور اچرج ہیں۔ اس قدر روپیہ بانٹ دینے کے باوجود فکرمندی اُس کے چہرے پر دکھائی نہیں دیتی۔ موت سے بھی نہیں ڈرتا۔

بادشاہ یہ سُن کر نہایت غضبناک ہوا۔ چاہا کہ رسول کا سرتن سے جدا کرا دے۔ لیکن جب انہیں سامنے بلایا گیا تو چہرہ پر سکون دیکھ کر بادشاہ کو حیرت ہوئی کہ

یہ کیسا انسان ہے کہ اس قدر نقصان کے باوجود اتنا مطمئن چہرہ، معصومیت ابھی بھی اس کے چہرے سے ہویدا ہے۔ وہ کچھ خائف سا ہو گیا اور مصلحت کے تحت کسی قسم کی خفگی ظاہر کرنے سے گریزاں رہا۔ حکم دیا کہ تاجر ہیں اور توما کو قید خانہ میں پابند رکھا جائے۔ تحقیقات مکمل ہو جانے پر فیصلہ کے مطابق ان سے سلوک کیا جائے گا۔

سب نے رسول کے چہرہ پر پھیلا ہوا سکون تو دیکھا۔ مگر خداوند جو اس کے باطن میں رہائش پذیر تھا اس کو کوئی نہ دیکھ سکا۔ رسول کا کارنامہ تو سب کے سامنے تھا۔ مگر خداوند کا کارنامہ باقی تھا جو وہ اپنے ایماندار بندوں کے لئے کیا کرتا ہے۔ مردکی جو خداوند کا بندہ تھا ہامان کے عتاب کا شکار ہو گیا۔ ہامان نے پوری یہودی قوم کے لئے بادشاہ اخسویرس سے پروانہ حاصل کر لیا کہ اس قوم کی نسل کشی کر سکے۔ خداوند نے صرف ایک دن پہلے مردکی کو بچانے کا بندوبست کیا۔ اور جس طرح چیونٹی سے ہاتھی جیسا عظیم الجثہ جانور مروا دیتا ہے ویسے ہی ہامان کا بھی حشر ہوا۔ اس واقعہ میں اسی رات جب خداوند کا بندہ عقوبت گاہ میں تھا خداوند نے ایک معجزہ کے ذریعہ اپنے بندہ کو نہ صرف رہائی بلکہ عزت و تکریم بخشی۔

بیان ہے کہ راجا کا بھائی جاد جو اسے بہت عزیز تھا ایک مہلک بیماری سے راہی ملک عدم ہوا۔ فرشتگان اس کی روح آسمان پر لے گئے۔ تو بہشت میں اس کی نظر ایک عالیشان گھر پر پڑی۔ جاد کو یہ محل بہت اچھا لگا۔ اس نے وہاں ٹھہرنے کے اجازت طلب کی۔ اسے بتایا گیا کہ یہ محل گونڈوفرس کے لئے ہے جو توما رسول نے اس سے خطیر رقم لے کر بنوایا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اس میں رہنے کا مجاز نہیں۔ جاد نے التجا کی کہ مجھے واپس دنیا میں بھیج دیا جائے۔ ادھر محل میں کہرام مچا ہوا تھا۔ بادشاہ بے حال تھا۔ اس کے دل میں ایک وسوسے نے جنم لیا کہ یہ سب کچھ کہیں اس بزرگ پر ظلم کا نتیجہ تو نہیں۔ وہ کف افسوس مل رہا تھا۔ شہزادہ کو کفن پہنا

دیا گیا۔ سبز وخاک کرنے لگے تو جادو کے جسم میں لرزش پیدا ہوئی۔ اس طرح حرکت کرنے پر سب لوگ حیران رہ گئے۔ اس عجیب وغریب واقعہ کی اطلاع بادشاہ وتک پہنچائی گئی۔ بادشاہ کو یقین نہ آیا۔ جب تک مردہ بھائی کو زندگی سے ہمکنار نہ دیکھ لیا۔ اُس نے مقدس توما اور تاجر حبین کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ حبین خوش ہو رہا تھا۔ مگر رسول فرطِ مسرت سے آبدیدہ ہوگیا۔ اور سجدۂ شکر کے لئے سر بسجدہ ہوگیا کیونکہ اُس نے جان لیا کہ میرا خداوند آگیا ہے۔ میرا شافی میرا نجات دہندہ جو ہر جگہ حاضر وناظر ہے۔ قیدخانہ میں اُتر آیا ہے۔ اُس نے حرف ربانی کا بند وبست ہی نہیں کیا۔ بلکہ بادشاہ کے دل ودماغ میں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ وہ مالکِ حیات ہے۔ اس لیے زندگی بخش دی ہے۔ ورنہ جادو کا زندہ ہونا ممکن نہ تھا۔

بادشاہ اور اُس کی رعایا رسول اور حبین کے منتظر تھے۔ جونہی وہ سامنے آئے لوگوں کو حیرت ہو رہی تھی کہ اس شخص کے چہرہ پر اطمینان کیوں ٹھہرا رہتا ہے۔ رسول کو دیکھتے ہی بادشاہ بیخود ہو کر اُن کے قدموں میں آگرا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ اپنے گناہوں اور زیادتیوں کا اقرار کرنے لگا۔ رسول ایسے موقع کو ہاتھ سے کیسے جانے دیتا۔ فوراً نجات بخش پیغام اُن کے سامنے پیش کرنے لگا۔

جس طرح حبشی خوجہ کو فلپس نے یہی پیغام دیا تھا تو اُس نے کہا پانی بھی ہے اب مجھے بپتسمہ لینے سے کونسی چیز روکتی ہے۔ بالکل ایسی ہی حالت راجا گوندوفرس کی تھی۔ اُس نے دست بستہ عرض کی ''اے بزرگ! تیرے خداوند کی مہربانی اور فضل میرے سامنے ہے۔ اب کونسی چیز مجھے بپتسمہ لینے سے روک سکتی ہے۔ اُس نے خداوند کو قبول کرلیا اور حلقہ بگوشِ مسیحیت ہو کر رسول کا دستِ نگر بن گیا۔ اس واقعہ نے تہلکہ مچا دیا۔ لوگ رسول کے قدموں میں بیٹھ کر خداوند کا حیات بخش کلام سننے لگے۔ اور یوں ایک کلیسیاء قائم ہوگئی۔

تو مارسول کی جو عزت افزائی ہوئی وہ بیان کی محتاج نہ تھی۔ کیونکہ ہ
لگے۔
اور تاجر ہیں بھی زیادہ وقت آپ کی قربت میں گزارنے
مقدس توما کے یہ علاقہ چھوڑ دینے کے بعد مسیحیت کے کوئی نشان نہیں ملتے
کیونکہ تاریخ اس کے بارے میں خاموش ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ مندرجہ ذیل شواہد
حقائق اور روایات سے پتہ چلتا ہے کہ توما رسول ۴۷ء میں ٹیکسلا میں آئے۔ چا
سال قیام کے بعد ۵۲ء میں جنوبی ہندوستان چلے گئے۔

روایات اور شواہد

مقدس توما کی ہندوستان میں آمد کے سلسلہ میں مستند ثبوت اور حقائق
آرچ بیکن برکت اللہ کی کتاب۔
''مقدس توما رسول ہند'' میں درج ہیں[1]۔
جناب ایس۔ این والڈ نے بھی انہی باتوں کا ذکر اپنی تصنیف ''مقدس
توما'' میں کیا ہے۔
۱۔ یہ آرچ بیکن برکت اللہ ہی ہیں جو فرماتے ہیں کہ ''توما رسول'' ہند
۴۸ء میں ٹیکسلا آئے اور پھر ۵۲ء میں وہ سقوطرہ سے جنوبی ہندوستان
آگئے
''مقدس توما رسول'' میں یوں ذکر ہے
۲۔ ایس۔ این والڈ فرماتے ہیں[2]۔ ''مقدس توما جب اپنے ملک سے

---

1. صلیب کے ہراول، حصہ دوم، برکت اللہ، روکسی پریس نئی دہلی ۱۹۳۹ء، صفحہ ۱۰۶
2. ایس۔ این والڈ، مقدس توما صفحہ ۶۱، ۹۵، ادارہ کاتھولک ادبیات
3. ولیم۔ جی۔ ینگ، رسولوں کے نقش قدم پر، صفحہ ۳۷، مسیحی اشاعت خانہ

روانہ ہوئے تو اُس وقت غالباً ۴۸ء بہار کا موسم تھا۔ ۵۲ء میں وہ جنوبی
ہند آئے اور وہ مدراس کی پہاڑی پر بھالوں سے شہید کر دیے گئے۔ اُس
وقت کے مسیحیوں کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ رسول کی لاش کو نہایت
عقیدت واحترام سے مائیلا پور میں سپرد خاک کیا۔

۳۔ جنوبی ہند کی کلیسیا کا عقیدہ ہے کہ توما رسول سقوطرہ سے کرانگا نور
۵۲ء میں پہنچے۔ انہوں نے مالابار میں سات کلیسیائیں قائم کیں اور بعد
میں مدراس چلے گئے۔ اور وہیں شہید کر دیے گئے۔

۴۔ مُقدس افرائیم سریانی کی تحریر میں جو ۳۷۰ء کی ہے لکھا ہے کہ
توما رسول ہند میں شہید ہوئے اور کسی نے اُن کی ہڈیاں ایدیسہ میں پہنچا
دیں۔

۵۔ رومی فہرستِ شہداء میں ایک بیان یوں ہے کہ توما نے مادیوں اور
فارسیوں میں منادی کی اور بعد ازاں ہند میں شہید ہو گئے۔

۶۔ ''نظریاتِ رُسل'' ایدیسہ میں کلیسیا کی ایک سریانی کتاب ہے جو
اغلباً ۲۵۰ء میں قلمبند ہوئی۔ اِس میں یوں ذکر ہے کہ یہوداہ مُقدس تُوما
کے ہاتھ سے ہند میں مخصوص کیا گیا۔

۷۔ بشپ میڈی کاٹ کا خیال ہے کہ توما رسول پارتھیہ اور افغانستان سے
ہوتا ہوا ٹیکسلا، کرانگا نور اُور جنوبی ہند چلا گیا۔

۸۔ طور کے گریگوری نے ۵۳۸ء میں یوں لکھا کہ زائر تھیڈرو نے
ہندوستان آکر مُقدس توما کے مزار کی زیارت کی اور پھر

۹۔ اِنگلستان کے بادشاہ الفریڈ اعظم نے ۸۸۳ء میں بشپ میگل نس کے
ہاتھ مائیلا پور خیرات بھیجی تھی۔

مقامی کلیسا بڑے احترام سے ٹیکسلا میں ہر سال مُقدس توما کی عید کے دن عبادتی میلے کا اہتمام کرتی ہے۔

ٹیکسلا سے مُقدس توما کی ہجرت

ایک معروف کہاوت ہے" جیسا راجا ویسی پرجا"۔ راجا گونڈوفرس کے مسیحیت قبول کر لینے کے بعد ہندو عوام دھڑا دھڑ حلقہ بگوشِ مسیحیت ہوتے چلے گئے۔ اور یوں گردونواح کے دیہات اور قصبات میں مسیحی مذہب کی تبلیغ ہوئی۔ توما رسول لوگوں کو یہی درس دیتے رہے کہ دنیوی دولت اور اقتدار پر بھروسا کرنے کی بجائے یسوع مسیح پر بھروسا رکھو کیونکہ اس طرح تمہیں خوشی اور نجات حاصل ہوگی۔ رسولِ ہند کا کلام سننے والوں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ بصد شوق بپتسمہ کے خواہشمند ہوئے۔

مُقدس توما کی تعلیم، زندگی اور روح القدس کی طاقت نے عوام کو مسیحیت کے لئے جیت لیا اور یوں کلیسیا قائم ہوگئی۔

لیکن انہی دنوں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا یعنی راجا گونڈوفرس کا اِنتقال ہوگیا۔ ابھی دو سال نہ گزرنے پائے تھے کہ کشن قوم نے چین سے آکر ۵۰ء میں قندھار فتح کیا اور پنجاب پر قبضہ کرلیا۔ کشن قوم کا راجا کنشک تھا جس نے پشاور کو اپنا دارالحکومت بنایا اور بدھ مت کی تبلیغ شروع کردی۔ کیونکہ وہ بدھ مت کا راسخ العقیدہ پیرو تھا۔ جو کوئی اُن کا عقیدہ قبول نہ کرتا اُس سے بہیمانہ سلوک کیا جاتا۔ مسیحیت کا تو وہ دشمن تھا۔ اُس کے ظلم و ستم کی وجہ سے مسیحیوں نے اس کے عقیدہ کو قبول کرنے اور مسیح خداوند کا انکار کرنے کی بجائے ٹیکسلا کو خیرباد کہہ دیا اور قریبی ملک فارس میں جا بسے۔ خیال مُطلق ہے کہ توما رسول نے ایک بشپ مقرر کیا اور خود سندھ کی طرف چلا گیا۔

اُس نے مخصہ کے مقام پر تھوڑی دیر کے لیے رہائش اختیار کی۔ آج
وہاں ایماندار درویشوں کی ٹولی موجود ہے جو بڑے فخر سے اپنے آپ کو مقدس
کے پیروکار بتاتے ہیں۔ مختصر قیام کے بعد وہ سندھ میں سے گزر کر سقوطرہ چلے گئے
یہاں سے جہاز ہندوستان جایا کرتے تھے۔ سقوطرہ میں رسول کی منادی کی بدولت
ایک کلیسیا قائم ہو گئی تھی۔ اسی قیام کے دوران چند ملاحوں سے ملاقات ہوئی
مصر سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی زبانی اسکندریہ میں مُقدس مرقس کی تبلیغ سے کلیسیا
کو جو فروغ حاصل ہوا اس کا ذکر سُن کر مُقدس توما کو نہ صرف حوصلہ ہوا بلکہ
یقین ہو گیا کہ کلام کا جو بیج میری معرفت بویا جائے گا وہ رائیگاں نہیں جائے گا
پھلدار ہوگا۔

موسم میں کافی تبدیلی واقع ہو چکی تھی اور سفر کے لیے موزوں تھا۔
مُقدس توما ہندوستان کی جانب اپنے راستہ پر گامزن ہو گئے۔ جہاز صیانت وسلا
کے ساتھ مالا بار ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ آپ نے اس سے پہلے کہ منادی شروع
کرتے خداوند کا شکر ادا کیا اور آئندہ کے لیے رہنمائی حاصل کی۔ اس جگہ بھی آ
کی منادی اور گواہی کلیسیاؤں کے قیام کا باعث بن گئی۔ آرچ ڈیکن برکت اللہ
کتاب ''مُقدس توما رسول ہند'' میں رقمطراز ہیں کہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ مُقدس
برتلمائی انجیل جلیل کا پہلا مشنری تھا جو یمن میں آیا۔ آرمینیا کا ایک مصنف فلسطی
کیسی PHISLOSTORGIUS برتلمائی کی تبلیغ کی بابت یوں لکھتا ہے۔

وسطی ہند کے مسیحی مُقدس برتلمائی کی منادی کے وسیلہ سے مسیحی مذہب میں
شامل ہوئے تھے۔

عین ممکن ہے کہ مُقدس توما کی شہادت کے بعد یمن سے مشنری لوگ وسطی

۱؎ رسولوں کے نقشِ قدم پر، ولیم جی۔ ینگ صفحہ ۵۳، مسیحی اشاعت خانہ

ہند آئے ہوں جنھوں نے مُقدس برتلمائی کی وجہ سے مسیح خداوند کو قبول کیا ہو۔ اور انہی مسیحیوں کی بشارت سے اس خطہ میں مسیحیت پھیلی ہو۔

تقریباً ۵۲۵ء تا ۵۳۵ء میں ایک ہندی سیاح جس نے خود کافی سفر کیا تھا اُس نے لکھا کہ لنکا میں مسیحی لوگ آباد ہیں۔ ہندوستان میں جگہ جگہ کلیسیائیں قائم ہیں۔ بے شمار گرجا گھر ہیں۔ جہاں بشپ ہیں۔ اُن کے ساتھ راہب بھی ہیں جو درویشانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بہرحال حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ توما رسول ہی سب سے پہلے ہندوستان آئے اور مسیحیت اُن کی وجہ سے قیام پذیر ہوئی۔ اور آج بھی ہندوستان میں لاکھوں بسنے والے لوگ، خاص کر کیرالا، جنوبی ہندوستان کے مارتھوما چرچ (MARTHOMA CHURCH) کے لوگ انہی کو اپنا بانی مانتے ہیں۔ یہ لوگ لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ اور ساری دُنیا میں تھوڑی بہت تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بہت ذہین، قابل، پڑھے لکھے اور بھارت کی سیاست اور سماج میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

راقم الحروف کو ۱۹۶۳ء میں کیرالا جانے کا اِتفاق ہوا تو اس کلیسیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ایک دُعا کا متمنی ضرور ہوا کہ اے خداوند! پاکستان کی مسیحی کلیسیا بھی اِن لوگوں کی طرح ترقی پا کر مسیح خداوند کی زندہ گواہ بن جائے۔

مُقدس تُوما کی شہادت کے بعد کلیسیائے

ہندوستان

مُقدس توما کی شہادت کے بعد ہندو پنڈتوں اور برہمنوں نے غریب ہندوستانی کلیسیا کا ناک میں دم کر دیا۔ انہوں نے کلیسیا پر ایسی ایسی الزام تراشیاں کیں جو آج بھی کلیسیاء پر ثبت ہیں۔ بلکہ آج بھی کلیسیا کو ان کا سامنا ہے۔ مثال کے طور پر مسیحی لوگ تین خداؤں کے پجاری ہیں اور مسئلہ نجات عجیب ہے۔ جو دوسروں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔

کلیسیائے ہند میں شاید اُن کی ٹکر کا کوئی آدمی نہ تھا۔ ایسی حالت میں چند راہبوں اور ذمہ دار لوگوں نے سوچ بچار کی کہ اگر یہی حالت رہی تو بہت ممکن ہے کہ ہندوستانی کلیسیا تنزل کا شکار ہو کر بالکل معدوم ہو جائے۔ اس صورت حال کے پیش نظر انہوں نے اسکندریہ کے بشپ سے مدد کی استدعا کی۔ اسکندریہ میں ۴۳ء میں مقدس مرقس نے بشارت دی تھی جس کے نتیجہ میں ایک کلیسیا وجود میں آ چکی تھی۔ اس کلیسیا نے تحقیق اور علم الٰہیات میں کافی ترقی کی تھی۔ کلیسیا کے بیشتر علما کفر اور بے ایمانی کے دور میں بڑا نام پیدا کر چکے تھے۔ مسیحیت نے اس شہر میں حکمت اور فلسفہ کے ماحول میں جڑ پکڑی۔ اس علم وفضل کے گڑھ میں یہاں پر علم الٰہیات کا ایک کالج بھی قائم ہوا۔ جس میں مسیحی ایمان، تعلیم اور اعتراضات کے بارے میں خوب بحث ومباحثہ کا بازار گرم رہتا تھا۔

اسکندریہ مسیحی علم الٰہیات اور مسیحی فلسفہ کے لحاظ سے یکتائے زمانہ تھا۔

اُس زمانہ میں یہاں کا بشپ باقی تمام پر فضیلت رکھتا تھا۔

۳۲۵ء بمیں نقایہ کی کونسل کے انعقاد اور فیصلہ میں اسکندریہ کی قیادت کو بہت عمل دخل تھا۔

مُقدس پینٹینیس PANTAENUS OF ALEXANDRIA C.190

۱۷۹ء میں دیمتریاس DEMETRIAS سکندریہ کی کلیسیا کا بشپ تھا۔ وہ تقریباً بیالیس برس تک کلیسیائی انتظامی امور بطریق اَحسن انجام دیتا رہا۔ اُسی کے زمانہ میں اسکندریہ کے مدرسۃ الٰہیات کو کالج کا درجہ دیا گیا۔ یہاں ایک عالم پینٹینیس آیا جو جزیرہ سسلی میں پیدا ہوا تھا۔ اُس نے ایتھنز یعنی یونان میں مزید تعلیم حاصل کی۔ طالب علمی کے زمانہ میں اُسے امتیازی حیثیت حاصل رہی۔ کلیمنٹ اور اوریجن جو کہ ممتاز اور جید عالم تسلیم کئے جاتے ہیں اسی عالم کے زیرِسایہ تعلیم حاصل کرتے رہے تھے۔

ان ہی دنوں بشپ دیمتریاس کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کیوں نہ پینٹینیس جیسے جید عالم کو ہندستان کی کلیسیا میں بھیجا جائے۔ یہ عالم اسکندریہ کالج میں بحیثیت پرنسپل اپنا فریضہ سرانجام دے رہا تھا۔ اُس کی وافر علمیت کی بدولت اُسے اُستادوں کا اُستاد تسلیم کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اُنہوں نے بہت تھوڑی دیر قیام کیا۔ مگر اسی قلیل عرصہ میں انہوں نے بحث ومباحثہ میں پنڈتوں اور برہمنوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اس کا ثبوت قرائن سے صاف ظاہر ہے۔ کیونکہ پھر اُنہیں اس عالم کی علمیت اور مسیحیت کی سچائی وصداقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ خداوند ہمیشہ ہر زمانہ میں ایسے عالم پیدا کرتا ہے کہ شیطان کا مقابلہ کیا جا سکے۔ خاص طور پر اُن کا جو اُس کی کلیسیا یعنی بدن کو ستاتے ہیں۔ اُنہیں وقت کے تقاضے کے باعث واپسی اختیار کرنا پڑی۔ مگر واپسی پر وہاں کی ایذا رسانی کے وقت ۲۱۱ء میں شہادت پا گئے۔ یہ بات

ہے افسوس کے ساتھ کہی جا سکتی ہے۔ کہ کلیسیا اچھے عالم سے محروم ہو گئی۔ میر تقی

میر نے ایسی ہستیوں کے لئے کہا ہے۔

فلک کی چرخ زنی برسوں ہو تو مجھ سا ہو

سمجھ بوجھ کے تنگ خاک میں ملا مجھ کو

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس عالم کو ہندوستان کے کس حصہ میں بھیجا گیا۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ مالا بار یا کورومنڈل کلیسیا جہاں مقدس

توما رسول نے قیام کیا بلکہ اُن مسیحیوں کے پاس آئے وعبرانی نسل یا یہودیوں میں

سے مسیحی ہوئے تھے اور مقدس برتمائی کی تبلیغی کوشش ان کے لئے مشعل راہ بنی تھی۔

خیال غالب ہے کہ یہ مسیحی مغربی ہند سے تھے۔ اور ان میں ہندی نژاد مسیحی بھی شامل

تھے۔ پینٹینس خود عبرانی النسل تھا۔

چوتھی اور پانچویں صدی میں ہندوستانی کلیسیا کا ایرانی کلیسیا کے ساتھ

قابل فخر الحاق رہا۔ ایرانی کلیسیا کی بنیاد ادیسہ (EDESSA) یا موجودہ عرفہ

کے مبلغین کی وساطت سے پڑی۔ اس کلیسیا کے عروج کا ثبوت یہ ہے کہ ایک وقت

تھا کہ ایران ہی کا بشپ ہندوستان کی کلیسیا کا نگران ہوا کرتا تھا۔

اُردشیر ساسانی

ایران کے ساسانی خاندان کے پہلے بادشاہ اُردشیر نے ۲۲۶ء میں

پارتھیا خاندان کو ختم کر کے خالص ایرانی بادشاہت کی بنیاد رکھی اور خود سریر آرائے

سلطنت ہوا۔ ابتداء میں ساسانی بادشاہ مسیحیت کے خلاف نہ تھے حالانکہ وہ زرتشتی

تھے۔ اُن کے ادوار میں مسیحیت نے خاصی ترقی کی۔ یہ کلیسیائیں خالصتاً ایرانی

تھیں۔ لہٰذا اُردشیر نے مسیحیت کے اقتدار کو تسلیم بھی کر لیا تھا۔

بشپ داؤد

پہلا ایرانی بشپ داؤد تھا جس کا تعلق بصرہ (خلیج فارس کے نزدیک) سے تھا۔ وہ بطور مبلغ ہندوستان آیا تاکہ انجیل کی بشارت دوسروں تک پہنچائے۔ یہ علم الٰہیات کا ماہر تھا اور اُس نے ساحل مالابار کو صدر مقام کے طور پر چنا۔

بشپ یوحنا اُسقف اِیران و ہندوستان

بشپ یوحنا اُسقف ایران اور شمالی ہندوستان خاص کر پنجاب کے علاقہ کا بشپ تھا۔ ساسانی خاندان کی سلطنت نہایت وسیع اور دنیا کی عظیم سلطنتوں میں سے تھی۔ دریائے سندھ سے فرات اور بحر ہند سے بحیرۂ کیسپین تک پھیلی ہوئی تھی۔ سندھ اور پنجاب اسی سلطنت کا حصہ تھے اور یہی ایرانی بشپ ان علاقوں کا بھی بشپ تھا۔

اس بشپ کے وقت میں نمایاں بات جو ایک بدعت کے طور پر اُبھری وہ اریس (ARIUS) کی تعلیم تھی۔ اُس کا عقیدہ یہ تھا کہ بیٹا مخلوق ہے اور بیٹا ابتدا سے خدا کے ساتھ نہ تھا۔ اُس کی اور خدا کی ذات میں بہت فرق ہے۔ اگرچہ وہ کل عالموں سے پیشتر خلق کیا گیا تھا۔ اس بدعت کے پیش نظر روم کے پہلے بادشاہ قیصر CONSTANTINE THE GREAT کو جس نے مسیحیت کو اپنا لیا تھا مجبوراً نائسیہ (نقایہ) کی کونسل منعقد کرنی پڑی جس میں ۳۱۸ بشپوں نے شمولیت کی۔ ان میں یوحنا ایرانی بھی تھا جو ہندوستان کی کلیسیاؤں کی نمائندگی کر رہا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نقایہ کی کونسل میں پنجاب کی کلیسیا کو بھی نمائندگی حاصل تھی۔ کیونکہ اُس وقت پنجاب کی کلیسیائیں ایران کی سلطنت کا حصہ تھیں۔ تمام بشپوں نے ایرئس (ARIUS) کی بدعت کے خلاف فتویٰ دیا۔ یہ شخص سکندریہ سے تھا۔ اور

اسقفی علاقہ کا ایک پریلیٹ تھا۔ نقایہ کا عقیدہ اُسی وقت سے رائج ہے۔ اور آج کل
بھارت اور پاکستان کا کلیساؤں کا عقیدہ بھی یہی ہے کیونکہ اُس وقت دنیا بھر کی
کلیسا ئیں اِس بات پر متفق ہوگئی تھیں کہ مسیح اور خدا اور روح تین الگ الگ ذاتیں
(اقنوم) نہیں بلکہ ایک شخصیت یا ذات (اقنوم) کی تین صفات ہیں۔ یہ تین اقانیم
ضرور ہیں۔ مگر ان کو باپ، بیٹا اور پاک روح کہا جاتا ہے۔

قیصریہ کے اُس وقت کے بشپ یوسی بیس نے بھی یوحنا اسقف ایران
وہندوستان کی نقایہ کی کونسل میں شمولیت کا ذکر کیا تھا کہ اس بشپ نے ایرانی
وہندوستانی کلیسیا کی نمائندگی کی تھی۔

ایذا رسانی اور شاہ پور اعظم

بشپ یوحنا کے سلسلہ میں یہ بات کلیسیائے تاریخ ہندو پاکستان میں
یاد رکھے جانے کے قابل ہے کہ ساسانی دور میں وہ اِن علاقوں کا اسقف تھا۔ اور
اُس نے نقایہ کے عقیدہ کی تشکیل میں ۳۱۸ بشپوں کے ساتھ اِس خطّہ کی کلیسیا کی
نمائندگی کی تھی۔

اردشیر کی رحلت کے بعد اُس کا بیٹا شاہ پور اعظم جو زرتشتی مذہب کا پیرو
کار تھا تخت نشین ہوا۔ اُسے مذہبی جنون کا بادشاہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ
اُس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ زرتشتی مذہب دوسرے مذاہب پر غلبہ حاصل
کرے۔ اُس کی سلطنت کے مغرب کی جانب مسیحی سلطنت رومہ تھی۔ اور دونوں کے
درمیان ایک طویل مدت سے مخاصمت چلی آرہی تھی۔ دیرینہ دشمنی اور مذہبی جنون
نے اس کے دل و دماغ میں خلجان کی کیفیت پیدا کردی۔ شاہ پور اعظم کو بہکایا گیا
کہ تیری سلطنت کے مسیحی تیری حکومت کے وفادار نہیں، اور نہ کبھی ہوں گے۔ اُس
کی وجوہات یہ تھیں۔

۱۔ ان مسیحی لوگوں کا رجحان رومی سلطنت کی طرف ہے۔ اور اسی کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔ کبھی اُن کے خلاف جنگ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔

۲۔ یہ ساسانی فوج میں بھرتی ہونے سے منکر ہیں۔

۳۔ ان کا عقیدہ جو پہاڑی وعظ سے وابستہ ہے وہ انہیں ساسانی حکومت سے وفادار نہ رہنے دے گا۔

اس قسم کے شکوک وشبہات نے شاہ پور اعظم کو مسیحیوں کے خلاف ابھارا۔ اُسی زمانہ میں ساسانیوں نے سلطنت روما پر حملہ کر دیا۔ مگر انہیں منہ کے کھانی پڑی۔ رومی بہادر سپاہیوں نے اُن کے دانت کھٹے کر دیے۔ مسیحیوں سے شکست کھانے کے بعد شاہ پور اعظم کی آتش غضب بھڑک اُٹھی۔ اسی پاداش میں اُس نے مسیحیوں پر ٹیکس بڑھا دیے بلکہ دوگنا کر دیے۔ بشپ شمعون نے یہ ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے لوگوں کو ٹیکس ادا نہ کرنے کا حکم دے دیا۔ بشپ کو غدار کا نام دیکر دیگر پانچ بشپوں کے ساتھ شہید کر دیا گیا۔ ایذارسانی ہر طرف پھیل گئی اور ساسانی علاقہ میں مسیحیوں پر بہت زیادہ ظلم ڈھایا گیا۔

شاہ پور اعظم ۳۷۹ء میں مر گیا۔ اور کلیسیا کو ستانے کا نتیجہ برآمد ہوا۔ لیکن اُس کے بھائی اردشیر نے تخت نشین ہوتے ہی اپنے بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ اُس نے اپنے چار سالہ دورِ حکومت میں اس ظلم کو روا رکھا مگر۔

کہاں ہے سکندر کہاں قیصر دارا

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

کلیسیا آج بھی قائم ہے مگر یہ لوگ آج نہیں ہیں۔

۴۱۰ء میں یزدگرد اول کے زمانہ میں تھوڑی دیر کے لئے کلیسیا کو آرام میسر آیا۔ یہاں تک کہ چند حقوق بھی عطا ہو گئے۔ لیکن ایرانی موبد اور عمائدین برا فروختہ ہو گئے۔ اس قدر بگڑے کہ بادشاہ اور سلطنت کے لئے خطرہ بن گئے۔ جس کی بدولت ایذا رسانی پھر شروع ہو گئی۔

بہرام گور

دس سال حکومت کرنے کے بعد یزدگرد اس دارِ فانی سے کوچ کر گیا۔ اور اُس کا بیٹا بہرام گور تخت نشین ہوا۔ یہ مشہور بادشاہ تھا جسے گور خر کے شکار کا شوقین ہونے کی مناسبت سے بہرام گور کہا جاتا تھا۔ جانوروں پر ظلم کا عادی ہو جانے کی وجہ سے انسانوں پر ظلم کرنا اُس کے نزدیک ایک کھیل تماشا تھا۔ اس نے ظلم کی انتہا کر دی بلکہ اگر اسے ساسانی خاندان کا ظالم بادشاہ کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں۔ کیونکہ تاریخ میں اس کی مثال ساسانی خاندان سے نہیں مل سکتی۔ اس کے ظلم پر ایک نظر ڈال کر تو دیکھیں۔ انسانی جسم کا ذرّہ ذرّہ لرز کر رہ جاتا ہے۔ لوہے کے کنگھے کے ذریعے منہ پر سے گوشت نوچ لیا جاتا تھا۔ مسیحیوں کو آرے سے چیر ڈالا جاتا تھا۔ بڑے بڑے گڑھے کھود کر انسانوں کو اُن میں ڈال دیا جاتا تھا اور وہ بھی ہاتھ پاؤں باندھ کر۔ اُس گڑھے میں بڑے بڑے چوہے چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ وہ چوہے اپنی بھوک مٹانے کے لئے انسانوں کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتے تھے۔ گھر بار لوٹ لئے جاتے تھے۔ جو لوگ مسیحیت قبول کر لیتے انہیں اس سے باز رکھنے اور ڈرانے دھمکانے کی خاطر ایسی کڑی سزائیں دی جاتی تھیں کہ اس کا تذکرہ نہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ گور کے معنی قبر کے بھی ہیں۔ اور اگر اس بادشاہ کو

قبریں بنانے والا یا کھودنے والا بھی کہا جائے تو یہ نام نہایت مناسب ہے۔ نئے مسیحیوں کو حکومتی عہدوں سے معزول کر کے، اُن کا درجہ گرا کر فیلبان بنا دیا جاتا تھا۔ جنگل صاف کرنے، سڑک بنانے اور کوہ کن کا کام کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ سنگلاخ چٹانوں پر گھسیٹا جاتا تھا۔ اور اُن کا گوشت جسم سے علیحدہ ہو جاتا تھا۔ انگلیاں اور ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جاتے تھے۔ اس قدر سنگین بربریت کا نشانہ بننے کے باوجود ایمان دار اپنے ایمان پر قائم رہے۔

ایسا وقت بھی آیا کہ ایک ہی وقت میں ایک لاکھ ترپن ہزار مسیحی شہید کر دیئے گئے۔ مگر ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ کئی موقعوں پر انہیں مصلوب بھی کر دیا گیا۔ آرے سے چیر دیا گیا۔ بعض اوقات سنگسار کر دیا جاتا رہا۔

پے در پے لرزہ خیز روح فرسا ایذا رسانی اور عذاب کلیسیا کے ایمان کو متزلزل نہ کر سکے۔ آخر کار توما نام ایک تاجر چند ہزار مسیحیوں کو لے کر جنوبی ہندوستان مالا بار ساحل کی طرف ہجرت کر گیا۔ مالا بار کے راجے نے نہ صرف اُن کی دلجوئی کی بلکہ کئی آسائشیں بھی مرحمت فرمائیں کیونکہ انسان جب ایک دروازہ بند کر دیتا ہے تو خدا کئی دروازے کھول دیتا ہے۔

ساسانی سلطنت کا انجام

انجیلِ مقدس میں لکھا ہے کہ جو تلوار کھینچتے ہیں وہ سب تلوار سے قتل کئے جائیں گے (متی ۲۶:۵۲)۔ مابعد کی صدیوں میں اسلام دشتِ عرب سے اُبھرا اور جلد ہی تمام مشرقِ وسطیٰ اور ایران پر چھا گیا۔ اسلام سے پہلے جس مذہب (زرتشت) کی تلوار اور دہشت گردی نے اہلِ دنیا کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اور تلوار سے مغلوب کرنا چاہا تھا اب وہ گزرے ڈیڑھ ہزار سال سے سسکیاں بھر رہا ہے۔ نہ اُن کی کوئی سلطنت ہے نہ گھر۔ بلکہ دُنیا میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔

جس طرح خداوند خدا نے یہودی قوم کو سزا دے دی اور ان کے گناہوں کو معاف نہ کیا جب تک توبہ نہ کی گئی۔ بالکل اسی طرح زرتشتی لوگ اور بادشاہ جو اپنے دور میں دنیا پر چھائے رہے۔ سکندریہ (مصر) ہندوستان، یونان اور شام کی سلطنتوں اور تہذیبوں کو زیر کرنے والے آج خود ان کے محکوم ہیں۔ سچ خداوند کلیسیا کو ستانے والے اپنی موت آپ مر گئے۔

اگر سکندر اعظم ایک وقت میں شہنشاہ ایران دارا کو شکست نہ دیتا تو شاید دارا جیسا فرمانروا دنیا پر چھا جاتا۔ لیکن کہاں وہ دن جب زرتشت حکومت کے سامنے کوئی سر نہ اٹھا سکتا تھا۔ اور کہاں یہ دن کہ ان کی تعداد آج صرف چند ہزار نفوس پر مشتمل ہے اور دنیا میں اگر دیکھا جائے تو ان کا کوئی مقام نہیں، کوئی سلطنت نہیں۔ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ظالم یہ لاٹھی دیکھ نہیں سکتا مگر جب برستی ہے تو ظالموں کا نشان مٹا دیتی ہے چونکہ اس نے فرمایا۔ انتقام لینا میرا کام ہے بدلہ میں ہی دوں گا۔ (عبرانی ۱۰: ۳۰)۔ خداوند کے ان وعدوں کو ایمان سے دیکھا اور یاد رکھا جا سکتا ہے۔

نسطوری کلیسیا

پاک و ہند کی کلیسیاؤں کی تواریخ پر غور کرتے ہوئے ایک بات ناقابل فراموش ہے کہ کلیسیاؤں میں بعض اوقات بدعتی خیال یا فرقے کلیسیاؤں کے لئے الجھن اور رکاوٹ کا باعث بنتے رہے۔

پانچویں صدی میں جب ساسانی دور حکومت میں ایذا رسانی ہوئی تو اسی وقت قسطنطنیہ کے بشپ نسطوریس (NESTORIUS) نے اعتراض کیا کہ۔

۱۔ مقدسہ مریم مسیح کی ماں تو ہیں مگر خدا کی ماں نہیں۔

دور حاضرہ کے روشن خیال مسیحی اس بات پر ضرور بشپ موصوف کے ہم خیال ہوں گے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ وہ زیادہ تجاوز کر گئے اور کہنے لگے کہ خداوند مسیح کی بشریت اور الوہیت دو الگ الگ اور جدا عناصر تھے۔ یعنی دو الگ ذاتیں تھیں۔ اسی بدعتی تعلیم کی وجہ سے ۴۳۱ء میں افسس کے مقام پر ایک کونسل منعقد ہوئی جس میں فیصلہ دیا گیا کہ بشپ مذکورہ کی تعلیم بدعتی ہے۔ اُس کی تصنیف کو جلا دینے کا حکم دیا گیا۔ کلیسیا سے اُسے خارج کر دیا گیا اور بالآخر ۴۳۹ء میں وہ نہایت لاچاری کی حالت میں مر گیا۔ اُس وقت اُس کا پُرسان حال کوئی نہ تھا۔ اور یہ بدعتی تعلیم کا نتیجہ تھا۔

۴۵۱ء میں کیلسڈون کی کونسل (COUNCIL OF CHARLCEDON) نے بھی نسطوری فرقہ کو بدعتی قرار دیا۔

روم کی سلطنت سے نسطوری ہم خیال بشپوں اور پریسٹ کو بے دخل کر دیا گیا۔ مگر چونکہ ساسانی اور رومی حکومت کی کبھی بن نہ پائی تھی اس لئے نسطوری خیال اور عقیدہ کے لوگ ایران اور ہندوستان کی جانب چلے گئے۔ ایرانی حکومت نے ۴۵۱ء میں نسطوری فرقہ کو محض اس لئے قبول کر لیا کیونکہ وہ رومی حکومت کے خلاف تھے۔

۴۹۸ء میں جو کونسل ایران میں یعنی سلوکیہ میں منعقد ہوئی اُس میں ایران کی کلیسیا نے مغربی کلیسیا سے اپنا تعلق توڑ لیا اور اس لاتعلقی کے ثبوت کے لئے اپنا نام بھی تبدیل کر کے کلدی مسیحی کلیسیا رکھ لیا۔ اس کلیسیا کے بعض مسیحیوں نے علم فلسفہ، سائنس، ریاضی، نجوم، خطابت و ترجمہ، منطق اور طب میں بڑی ترقی کی۔

۶۰۸ء میں ساسانی حکومت دم توڑ رہی تھی اور نسطوری مسیحی علم و فلسفہ

میں بہت ترقی کر چکے تھے۔ مسیحیت ایذا رسانی کے وقت بھی ہر سو پھیلتی چلی گئی تھی یہاں تک کہ نسطوری کلیسیا چھٹی صدی میں پنجاب، شمال مغربی، مشرقی ہند اور بنگال تک جا پہنچی۔

ایک مقام پر کاسمس (COSMAS) جو سکندریہ کا ایک تاجر تھا۔ وہ ہندوستان آیا اور اس نے چشم دید حالات لکھے۔

''ہندوستان میں کلیسیا فارغ البال ہے۔ کلیسیائیں اور گرجا گھر عام دیکھے جا سکتے ہیں۔ انجیل ترقی پا رہی ہے۔ بحر ہند میں ایک جزیرہ لنکا ہے، وہاں بھی مسیحی کلیسیا موجود ہے۔ مالا بار میں مرچیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کلیسیا کے بشپ کی تقدیس ایران کا بشپ کرتا ہے۔ ایرانی کلیسیا کے لوگ بھی یہاں آ کر آباد ہو گئے ہیں۔

ساحل کورومنڈل اور ساحل مالا بار پر نسطوری کلیسیا قائم تھی۔ مگر چونکہ ہندو بت پرستی کے قائل تھے۔ اور مسیحی ایک خدائے واحد کی پرستش کرتے تھے۔ اس لئے ہندو فلاسفر اور برہمن کسی طرح بھی اس نئے مذہب کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ان کی مخالفت یہاں تک بڑھ گئی کہ بہت سے ہندو خاص کر اونچی ذات کے ہندو ایک بار پھر واپس اپنے عقیدے میں جانے پر مجبور کر دیے گئے۔

۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کے توسط سے اسلام نے ہندوستان پر پہلی بار قدم جمائے۔ اس سے قبل اسلام ایران میں قدم جما چکا تھا۔

نئی اسلامی حکومت نے ایرانی علاقہ میں کرمان، بلخ، بخارا، سیستان، خراسان اور افغانستان کو اپنی عملداری میں شامل کر لیا۔ انہی جگہوں میں نسطوری اور کلدی کلیسیا کے مسیحی بھی آباد تھے، بلکہ سکونت پذیر تھے۔ اس وجہ سے ان

کلیساؤں کے لوگ تتر بتر ہو گئے۔ لاکھوں مسیحی مارے گئے۔ ہزاروں کو اسلام قبول کرنا پڑا۔ مسیحیوں کے شہر تباہ کر دیئے گئے۔ اس سلسلہ میں ایرانی علاقہ میں بسنے والے مسیحیوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچا۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھاگ کر کردستان یا ہندوستان کی طرف چلے گئے۔ ۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم میں نسطوری یا کلدی کلیسیا کے لوگ ترکی حکومت کے خلاف تھے۔ اس لیے اتحادی فوجوں کے میسر آنے پر ان پر سخت ظلم ڈھائے گئے۔ کلدی کلیسیا کے تین لاکھ افراد لقمہ اجل بن گئے۔ جو باقی بچے وہ آج اپنے آپ کو نسطوری یا کلدی کلیسیا یعنی ایشیا کے مشرقی کلیسیا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کی تعداد آج آٹے میں نمک کے برابر ہے بلکہ ہندو پاک سے تو ان کا نام بھی مٹ چکا ہے۔

سلاطینِ دہلی اور مسیحیت

نسطوری یا کلدی کلیسیا کا عروج اور زوال دیکھنے کے بعد اب یہ خیال سامنے آتا ہے کہ وہ کلیسیا جو مالابار، کورومنڈل اور ساحل شمالی ہندوستان، بنگال اور پنجاب میں قائم ہو چکی تھی اُس کا حشر کیا ہوا۔ ایک وقت تھا جب یہ کلیسیا رو بہ ترقی تھی۔ یہاں پر بشپ تعینات کیئے جاتے تھے۔ بشپ داؤد اور بشپ یوحنا ایران میں رہتے ہوئے ہندوستان کی کلیسیا کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ ایران اور ہندوستان کی کلیسیائیں الگ الگ ہو گئیں۔ کیونکہ اسلام کی آمد کے بعد ایران سے سیاسی رشتہ بالکل ٹوٹ گیا۔ اس لئے کلیسیا کو بھی اپنا تعلق توڑنا پڑا۔

کلیسیا مسیح کا بدن ہے۔ اور مسیح خداوند نے خود اپنی زبان مبارک سے فرمایا تھا کہ لوگ میرے نام کے سبب تم سے عداوت رکھیں گے۔

اسلامی دور ہی کلیسیا کے خلاف نہ تھا۔ بلکہ اگر تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ساسانی بادشاہ جو زرتشت تھا اور جس کی سلطنت ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی اُس نے مسیحیت کو برداشت نہ کیا۔ یہ ہندو برہمن ہی تھا جس نے توما رسول کو قتل کیا۔

رسولِ عربی ۵۷۱ء میں عرب میں پیدا ہوئے اور ۶۳۲ء میں آپ کے وصال کے پندرہ برس بعد حضرت عثمان کے عہد میں اسلامی اقوام نے تھانہ پر حملہ کیا مگر یہ حملہ تھا عارضی۔

۷۱۲ء میں محمد بن قاسم جو حجاج بن یوسف کا بھتیجا تھا اُس نے سترہ برس کی

عمر میں اسلامی افواج کی کمان سنبھالی اور دیبل (کراچی کے نزدیک) پر حملہ کیا اور ملتان تک بڑھتا چلا گیا۔ ملتان تک کا علاقہ اُس نے فتح کر لیا۔ تین سال کے قیام کے دوران اگرچہ اُس نے سلطنت میں بڑی دلچسپی لی مگر اُسے جلد واپس جانا پڑا۔ اس کے وقت میں ملتان اور سندھ میں مسیحی کلیسیائیں آباد تھیں۔ محمد بن قاسم کا پہلا حملہ تھا جو سمندر کی طرف سے عربی قوم نے کیا۔ اگر محمد بن قاسم کو مسلمانوں کا پیشرو کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

محمد بن قاسم کے بعد محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملے کئے اور ملتان، لاہور اور اجمیر فتح کرنے کے بعد سومناتھ تک بڑھتا چلا گیا۔ سومناتھ میں (کاٹھیاواڑ) ہندوؤں کا ایک عظیم مندر تھا۔ یہ حملہ ۱۰۲۴ء میں کیا گیا۔ اس مندر سے بے پناہ مال و دولت حاصل کرنے کے بعد محمود غزنوی اپنے وطن لوٹ گیا۔ اُس نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ ان حملوں کے دوران ہندوستان میں مسیحیت کو بہت نقصان پہنچا۔ کلیسیائیں پراگندہ ہوگئیں۔ پنجاب اور سندھ کے مسیحی بھی نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوگئے۔

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے کہ جن وقتوں کا ذکر ہو رہا ہے جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا اصول پیشِ نظر رکھا جاتا تھا۔ بادشاہ کے لئے کسی کو قتل کرا دینا یا کر دینا کوئی خاص بات نہ تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسانی حقوق کی پامالی معمولی سی بات تھی۔

حملہ آوروں کا سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ شہاب الدین غوری نے اپنے حملوں کے دوران کئی گرجوں اور مندروں کو مسجدوں میں تبدیل کروا دیا۔ شہاب الدین غوری کو ۱۲۰۶ء میں بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔ اور قطب الدین ایبک جو خاندانِ غلاماں کا بانی تصور کیا جاتا ہے تختِ دہلی پر فروکش ہوا۔ یہ پہلا مُسلمان

بادشاہ تھا جس نے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ اُس کے عہد میں کوئی مسلمان مسیحیت قبول نہ کر سکا تھا۔ وہ ۱۲۱۰ء میں لاہور میں چوگان کھیلتا ہوا گھوڑے سے گر کر زندگی کے انجام تک پہنچا۔ انارکلی بازار میں لوہاری دروازے کی جانب سے بائیں طرف ایک روڈ پر جو اُس کے نام سے نامزد ہے اُس کا مزار دیکھا جا سکتا ہے۔

قطب الدین ایک کے بعد ایک اور قابل حکمران آیا اُس کا نام التمش تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دوسرے بادشاہوں سے مختلف تھا۔ مگر اُس نے بھی اپنے عہد میں مسیحیت کو کوئی خاص مراعات حاصل نہ کرنے دیں۔

التمش نے ۱۲۳۶ء میں وفات پائی اور اس کے بعد اسکی بیٹی رضیہ سلطانہ اور ناصر الدین تخت نشین ہوئے۔ رضیہ سلطانہ کو تو زیادہ دیر تک بادشاہت کرنے کا موقع میسر نہ آیا لیکن اُس کے بھائی ناصر الدین نے ۱۲۴۶ء تا ۱۲۶۶ء یعنی بیس برس تک حکومت کی۔ وہ انتہائی نیک اور پارسا بادشاہ تھا اور اُس نے ہر ایک مذہب کی پاسداری کی۔ ہر طرح سے خیال رکھنے کی خاطر خواہ کوشش کی۔

۱۲۶۶ء میں ناصر الدین کے انتقال پر بلبن تخت نشین ہوا۔ وہ بیس برس تک تخت دہلی پر براجمان رہا۔ وہ تھا تو بہت بہادر مگر طبعاً سخت گیر انسان تھا۔ دشمن کا صفایا کر کے ہی دم لیتا تھا۔ اس نے منگولوں کے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اپنے دورِ حکومت میں جنگوں میں مصروف رہا۔ لہٰذا سلطنت کو مستحکم کرنے کے لئے اُسے وقت میسر نہ آیا۔ اُس کے زمانہ میں مسیحیت کسی بڑے نقصان سے البتہ محفوظ رہی۔ دراصل جنگوں میں مصروفیت نے اُسے دوسرے مذاہب کی طرف دھیان دینے کا موقع نہ دیا۔

بلبن کے بعد علاء الدین خلجی جو خلجی خاندان کا معروف بادشاہ تھا

۱۲۹۵ء سے ۱۳۱۶ء تک سلطنت کرتا رہا۔ وہ ترک نژاد تھا۔ بڑا ضدی اور رحم سے نابلد تھا۔ اُس کا دور کلیسیائی امور اور ترقی کے لئے بڑی بے رحمی کا دور تھا۔ اُس نے مسیحیوں پر ستم روا رکھا۔

خلجی خاندان کے بعد تغلق خاندان کا دور آیا جس نے ۱۳۲۰ء سے ۱۴۱۴ء تک حکومت کی باگ ڈور سنبھالے رکھی۔ پہلے بادشاہ کا نام محمد بن تغلق عرف جونا تھا جس کے اسی نام کیا مناسبت سے جوناگڑھ اور جونپور بسائے گئے۔ اپنے غلط کارناموں کی بنا پر بڑا بدنام ہوا۔ یہ مسیحیت کا بہت مخالف تھا۔ حق تو یہ ہے کہ سلاطین دہلی نے اپنے دور میں مسیحیت کو اس قدر نقصان پہنچایا کہ مسیحی راہ فرار اختیار کرنے اور دور دراز علاقوں میں بسنے پر مجبور ہو گئے۔

فیروز شاہ تغلق غریبوں کا ہمدرد بادشاہ تھا۔ مگر دوسرے عقیدہ والوں کو قطعاً پسند نہ کرتا تھا۔ وہ معمولی اختلاف پر بھی برہم ہو جاتا اور سخت سزائیں دیتا تھا۔ ہندو اور شیعہ بھی اس کے ظلم سے نہ بچ سکے۔ غیر ملکی سیاح لکھتے ہیں کہ اس دور میں مسیحی آٹے میں نمک کے برابر تھے۔

تیمور لنگ اور مسیحیت

فیروز شاہ ۱۳۳۸ء تک ہندوستان میں سلطنت کرتا رہا۔ ۱۳۹۸ء میں جب تغلق دور قائم تھا تو وسط ایشیا سے تیمور لنگ ایک لشکر جرار لے کر پنجاب تک آ پہنچا۔ اُس نے پہلے ہی ایران، مسوپتامیہ، عراق اور افغانستان کی کلیسیاؤں کو برباد کر دیا تھا۔ وہ آندھی کی طرح آیا اور بگولے کی طرح ہندوستان سے چلا گیا۔ مگر اُس نے قتل و غارت کا وہ بازار گرم رکھا کہ ہندوستان کی تاریخ اُس کے ظلم اور سفاکی کی داستان سناتی ہے۔ اُس کے ظلم کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اُس نے دہلی میں تقریباً ایک لاکھ انسانوں کا خون بہایا۔ دہلی، ہردوار اور میرٹھ جہاں

کہیں وہ گیا انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کاٹ کر پھینکتا رہا۔

تیمور لنگ نے کلدی کلیسیا کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو چن چن کر قتل کیا۔ وہ انسانی خون کا پیاسا تھا۔ اس خونخوار انسان نے مسیحیت کی اس خطہ سے ایسی بیخ کنی کی کہ مسیحیت کا نام تک مٹ کر رہ گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں مسیحیوں نے اسلام قبول کر کے اپنی جانیں بچائیں۔ اُس نے مدرسوں اور گرجا گھروں کو برباد کر کے رکھ دیا۔ مسیحی رہنماؤں اور علما کو چن چن کر قتل کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ ظلم و تشدد کے خلاف تھے۔ کیونکہ مسیحیت درسِ محبت دیتی ہے۔ انہوں نے ظالم کا ساتھ دینے سے انکار کیا کیونکہ یہ بات بھی مسیحیت کے منافی ہے، ظالم کو ظلم سے باز رہنے کی تلقین کی۔ کلیسیا نے کئی موقعوں پر ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی اور اس طرح خود پس کر رہ گئی۔ تاریخ کی شہادت کافی ہے کہ تیمور لنگ کے ساتھ کس نے یہ سلوک روا رکھا تھا۔ جس کے نتیجہ میں کلیسیا خود حرف غلط کی طرح مٹ گئی۔ ہندوستان میں کلیسیا پر تیمور لنگ نے ایسا ظلم روا رکھا جس کی مثال نہ ماضی میں تھی اور نہ ہی اُس زمانہ میں۔

تیمور لنگ کے حملہ کے بعد کلیسیا کونوں کھدروں میں گھس کر رہ گئی۔ جو کلیسیا کے بقیہ کے طور پر رہ گئی۔

جیروم

بیت اللحم سے جیروم لکھتے ہیں ''ہمارا بقیہ ہماری کسی نیکی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض خدا کے فضل سے ہے''۔

جیروم کا یہ ذاتی تجربہ تھا اور یہ تجربہ جہاں تک مسیحیت کا تعلق ہے بیس صدیوں پر محیط ہے۔ مسیحیت شمالی افریقہ اور ایشیاء کے ممالک میں ستائی جاتی رہی اور ایذا رسانی کا مقابلہ کرتی رہی۔ مگر یہ لوگ تلوار کے آگے [illegible]

کرنے کی بجائے ظلم و جور کے وقت نقل مکانی کو ترجیح دیتے تھے۔

کیونکہ خداوند یسوع نے فرمایا۔ اگر کوئی تم کو قبول نہ کرے تو اپنے پاؤں کی گرد جھاڑ کر وہاں سے چل دو۔ اور جب تم کو ایک شہر میں ستائیں تو دوسرے کو بھاگ جاؤ۔ متی ۱۰: ۱۴، ۲۳۔

اصل بات تو یہ تھی کہ مذہب کے پنپنے کے لئے یہ انتہائی ضرور ہے کہ حکومت اور بادشاہ خود بھی اس مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اور اس کی آبیاری کرتے ہوں۔ لیکن ایشیا کے ممالک میں معاملہ اس کے برعکس تھا۔

مُغلیہ حکمران اور مسیحیت

اسی امر کی روشنی میں اب ہمیں سب سے مضبوط اسلامی سلطنت کا جائزہ لینا ہے جو ۱۵۲۶ء تا ۱۷۰۷ء تقریباً پونے دوسو سال قائم رہی۔ یہ مغلیہ سلطنت تھی جس کا ڈنکا سارے ہندوستان میں بجتا رہا۔ بلکہ یہ کہنا نہایت بہتر ہے کہ اس عظیم سلطنت کے آثار عمارات اور باغات کی صورت میں زبان حال سے عظمت رفتہ کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔

پہلا مغل حملہ آور ظہیر الدین بابر تھا جو ترکستان کی ایک ریاست فرغانہ کا رہنے والا تھا۔ اور اس طرح اُس کا تعلق وسط ایشیا سے تھا۔ اُس نے ۱۵۲۶ء میں دہلی کے بادشاہ ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دی اور دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔

بابر بادشاہ صرف چار سال ہندوستان پر حکومت کرتا رہا۔ اور ۱۵۳۰ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ اُس کے بعد اُس کا بڑا بیٹا ہمایوں جس کے معنی مبارک کے ہیں تخت نشین ہوا۔ مگر اُس کی زندگی اُس کے نام کی نفی کرتی رہی۔ وہ سارا وقت دشمنوں میں گھرا رہا۔ اُسکی وفات کے بعد اُس کا بیٹا جلال الدین اکبر

تخت پر بیٹھا۔ یہی وہ بادشاہ ہے جو مغل اعظم یا اکبر اعظم کے نام سے مشہور ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ جن مسلمان بادشاہوں نے دہلی کے تخت پر حکومت کی ان میں سے کوئی بھی اکبر کا ہم پلہ نہ تھا۔ اسی لئے وہ سارے مسلمان بادشاہوں میں سرفراز گنا جاتا ہے۔

اکبرِ اعظم اور مسیحیت

اکبر نے ۱۵۵۶ تا ۱۶۰۶ء ہندوستان پر حکومت کی۔ وہ واقعی اعظم کے نام کا مستحق ہے۔ اگرچہ وہ مسلمان تھا مگر اس نے دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کا سلوک روا رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو راجپوت راجاؤں نے جن میں مان سنگھ اور بھگوان داس بہت مشہور ہیں، اکبر بادشاہ کا بڑا ساتھ دیا۔ اور رانا اودے سنگھ اور پرتاپ سنگھ جیسے راجپوت راجاؤں سے برسرپیکار رہے، اور تمام عمر اکبر کے مطیع رہ کر مغلیہ سلطنت کو مستحکم کرتے رہے۔ اس عظیم بادشاہ کی رواداری اس حد تک بڑھ گئی کہ اس نے ایک علیحدہ اور نیا دین جو سارے مذاہب کو یکجا کر کے بنا ڈالا جس کا نام دینِ الٰہی رکھا گیا۔ اس دین کے یہ اصول تھے کہ خدا ایک ہے اور سارے مذاہب میں سچائی ہے۔ اس نے غیر مسلمانوں کے لئے جزیہ منسوخ کر دیا۔ ہندوؤں اور مسیحیوں کو کامل آزادی دے دی۔ اکبر اپنی مذہبی رواداری کے سبب کامیاب رہا۔ اور اسی کامیابی نے اُسے پچاس سال حکومت کرنے کا موقع فراہم کیا۔ لیکن جب اورنگ زیب نے اس رواداری کی پالیسی کو ترک کیا تو اس کے جیتے جی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ وہ کسی غیر مسلم کو کیا بلکہ شیعہ فرقہ کے لوگوں کو بھی پسند نہ کرتا تھا جب کہ وہ بھی مسلمان ہی گنے جاتے ہیں۔ اکبر نے مسیحیوں کو صرف مذہبی آزادی ہی نہ دے رکھی تھی بلکہ مسیحی دین کی بابت بحث مباحثہ بھی کیا کرتا تھا۔ گرجا گھروں اور عبادت گاہوں کی تعمیر پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اس کے



سینٹ جانز چرچ لاہور (مقبرہ انارکلی) جو سیکرٹریٹ میں واقع ہے۔ اسے انگریزوں نے
پنجاب فتح ہونے کے بعد بحیثیت کتھیڈرل ۱۸۴۹ء تا ۱۸۸۷ء استعمال کیا۔

دربار میں مسیحی علما غیر ممالک سے یہاں رہائش پذیر تھے بلکہ انہیں مسیحی مذہب کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ اکبر ان سب کی باتیں بڑے غور سے سنتا تھا لیکن وہ کبھی بھی مسیحی نہ ہوا۔ اس کی اپنی ایک بیوی مسیحی تھی جس کا اکبر کی شخصی زندگی پر بڑا اثر تھا۔

فرانس زیویئر کی آمد FRANCIS ZAVIER

مغلیہ دور کا ایک مشہور واقعہ یہ ہے کہ رومن کیتھولک فرقہ میں سے پہلا مشنری فرانس زیویئر ۱۵۴۲ء میں ہندوستان آیا۔ وہ گوا میں رہا اور اس نے ہندوستان میں مسیحیت کا بہت پرچار کیا۔ اس کی قبر اس کی آمد اور پرچار کا ثبوت لئے گوا میں آج بھی موجود ہے۔

اکبر اعظم کے عہد میں لاہور میں ایک گرجا گھر بھی بنایا گیا۔ مگر آج اس کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ خیال ہے کہ یہ عبادت گاہ لاہور قلعہ کے قریب ہی تھی۔ اس دور حکومت میں شمالی ہند میں مسیحیت نے خوب فروغ حاصل کیا۔ اور فادر صاحبان کو تحریری اجازت نامہ بھی دے دیا گیا کہ کسی شخص کو مسیحیت قبول کرنے سے منع نہ کیا جائے۔ اس بادشاہ کے زمانہ میں لاہور میں ایک سو کے لگ بھگ مسیحی آباد تھے۔

ایک اور واقعہ جو قابل ذکر ہے۔ کہ اسی عہد میں **پرتگیز** (PORTUGEES) پرتگال سے تجارت کی غرض سے آنے شروع ہو گئے۔ اور اُن کی آمد سے مسیحیت میں جیسے دوبارہ جان آگئی۔ کیونکہ اس سے قبل گزرے وقتوں میں مسیحیت دم توڑ گئی تھی۔ مسیحیت کا پودا جو مرجھاتا جا رہا تھا ایک بار پھر ہرا ہونا شروع ہو گیا۔ اس ضمن میں **پرتگیز** مشنریوں اور مسیحیوں کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔ **پرتگیزوں** کی دیکھا دیکھی انگلستان سے انگریز بھی وارد ہونا شروع ہو گئے۔ انہوں نے بھی چاہا کہ **پرتگیزوں** کی طرح تجارت کی غرض سے ہندوستان میں قدم جمائیں۔ پرتگیز مشنریوں میں بعض بہت بڑے عالم بھی آئے جن میں

فرانسس زیویئر کا نام سرفہرست ہے۔
اکبر کے عہد میں آگرہ میں ایک گرجا گھر ۱۵۹۴ء میں تعمیر کیا گیا۔ گرجا
چھوٹا تھا اور چونکہ مقامی مسیحیوں کی ضرورت کو پورا نہیں کرتا تھا اس لئے سوچا گیا کہ
اس کی جگہ ایک عالیشان گرجا گھر بنایا جائے۔ جہانگیر (شہزادہ سلیم) نے مقامی
مسیحیوں کی مدد کی اور اپنے باپ اکبر سے ایک ٹکڑا زمین اس مقصد کو عملی جامہ
پہنانے کے لئے لے کر دیا۔
شہزادہ سلیم نے از خود چار ہزار روپے گرجا گھر کی عمارت کے لئے
عطا کئے۔ بارہ ہزار کی لاگت سے یہ گرجا گھر بنا۔ باقی روپیہ آرمینی مسیحیوں نے اکٹھا
کیا۔ اور یہ عبادتگاہ ۱۶۰۴ء میں اکبر بادشاہ کی موت سے ایک سال پہلے تعمیر
ہوئی۔ لوگ بادشاہ کی اس مدد کی وجہ سے اُسے اکبر کا گرجا کہتے تھے۔ سولہویں
صدی میں انجمن یسوع (SOCIETY OF JESUS) قائم کی گئی۔ یہ پوپ نے
شروع کی۔ اس انجمن کا کام بدعتی کلیسیا کو پوپ کے زیر اثر رکھنا، تبلیغی کام کو فروغ
دینا اور پوپ کے اقتدار کو تسلیم کروانا تھا۔
یہ انجمن یسوع ہندوستان میں بھی اپنا فریضہ انجام دینے پہنچ گئی۔ اسی
انجمن کے ممبر کا علم و فضل میں تمام دُنیا میں عالم تسلیم کیئے جاتے تھے۔ اُن کی تربیت
اس طور پر کی جاتی تی کہ وہ مناظرہ میں یکتائے روزگار شمار ہوئے۔ جب البوکرک
(ALBUKARK) نے ۱۵۱۰ء میں گوا کو فتح کر لیا اور پرتگیزوں کے لئے
ہندوستان آنے کے تمام راستے ہموار ہو گئے۔ تو انجمن یسوع کے لئے مُبلغین سب
سے پہلے گوا ہی کے لئے آئے۔ اس کے بعد وہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں
چلے جاتے تھے۔ انہی مُبلغین میں سے ایک نے اکبر اعظم کو رائل بائبل
(ROYAL BIBLE) کا ایک نسخہ پیش کیا تھا۔

اکبر کے عہد میں صرف پرتگیزی یورپی دنیا سے ہندوستان نہیں آئے تھے بلکہ ہسپانیہ کے مسیحی بھی ہندوستان میں وارد ہوئے بلکہ اس وقت کلدی، آرمنی، نسطوری اور بعد میں ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز بھی آہستہ آہستہ آنے شروع ہو گئے۔ اگرچہ ان کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی کیونکہ یہ تجارت کی غرض سے آتے تھے۔

۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گاما راس اُمید کا چکر کاٹ کر ہندوستان کے مالابار ساحل یعنی کالی کٹ کے بالمقابل لنگر انداز ہوا۔ اس کے بعد دوسری یورپی اقوام بھی میدان میں کود پڑیں۔ ان کی آمد سے ایک زبردست فرق یہ پڑا کہ ان یورپی اقوام نے اسلام کی تقریباً چھ سو سالہ سمندری تجارتی برتری کو ختم کر دیا۔ اور خود بحر ہند کے مالک بن بیٹھے۔ ان کے وارد ہونے سے پہلے بحیرہ عرب اور بحر ہند میں عرب تاجروں کی اجارہ داری تھی۔

جہانگیر کا دور

اکبر نے ۱۶۰۵ء میں وفات پائی اور سکندرآباد میں دفن کیا گیا۔ اُس کے پچاس سالہ دورِ حکومت کو امن کا دور کہا جا سکتا ہے۔ جہانگیر نے باپ کی ہمرکابی میں رہ کر مذہبی فراخ دلی اور رواداری سیکھ لی تھی۔ اُس کی بیوی بھی راجا بھگوان داس اور مان سنگھ کے خاندان سے راجپوت خاتون تھی۔ اس بنا پر جہانگیر کے لئے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اُس نے کبھی دوسرے مذاہب میں خواہ مخواہ دخل اندازی نہیں کی۔ لیکن اس کے باوجود باپ اور بیٹے میں نمایاں فرق تھا۔

اکبر حقیقت میں حق کا طالب تھا اور وہ ایک دیندار مذہبی شخص تھا۔ اُس میں معافی کا جذبہ بھی تھا۔ لیکن جہانگیر مذہب کا ویسا دلدادہ نہ تھا۔ وہ مسیحی عقائد اور مسائل سے اچھی طرح واقفیت رکھتا تھا۔ اکبر کی طرح حق کا طالب نہ تھا۔

اکبر کے اتالیق بیرم خاں نے بے وفائی کی اور اکبر کی مخالفت کرنے لگا
جب وہ اکبر کے سامنے آیا تو اکبر کا رویہ دیکھ کر اپنا سر اُس کے پاؤں پر رکھ دیا اور
زار زار رونے لگا۔ یہ اکبر ہی کا دل تھا کہ اس نے بیرم خان کو معاف کر دیا۔ اس
کی جگہ اگر جہانگیر ہوتا تو شاید بیرم خان کو ختم کروا دیتا۔

جہانگیر ویسے بھی شراب کا دلدادہ تھا جس کی بدولت وہ اکثر آپے سے
باہر ہو جاتا تھا۔ جب وہ مدہوشی میں کھو جاتا تو نوکر اُس کی حالت سے خائف ہو کر
اِدھر اُدھر چھپ جاتے۔ پادری جیروم زیویئر کا اس کی زندگی پر بڑا اثر رہا۔ اس
پادری صاحب کا فرانسس زیویئر سے قریبی تعلق تھا۔ بادشاہ اُس کی باتوں سے بڑا
محظوظ ہوتا اور اُن پر غور و خوض کیا کرتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جہانگیر نے
گلے میں صلیب بھی آویزاں کیئے رکھی۔ آگرہ اور پٹنہ کے گرجے جہانگیر کی
رواداری کی بدولت بنائے گئے۔

مبلغین اپنے ساتھ مسیحی تصاویر بھی لایا کرتے تھے اور یہ اکبر اور جہانگیر
کے دربار میں پیش کی جاتی تھیں۔ دونوں باپ بیٹا ان تصاویر کو غور سے دیکھتے اور
اُن کے پس منظر سے روشناس ہونے کی کوشش کرتے تھے۔

پادری برکت اللہ[1] فرماتے ہیں کہ ۱۶۱۳ء میں لاہور میں تقریباً (۱۰۰۰)
ایک ہزار مسیحی لوگ آباد تھے۔ ان میں اطالوی، شامی، پرتگیز، کلدی، نسطوری اور
انگریز نسل کے لوگ بھی شامل تھے۔ کلیسیا مقامی لوگوں ہی کی نہ تھی بلکہ بدیسی لوگ
بھی اس میں شامل تھے۔ جو تجارت، فوج یا سول کاموں کے لئے ہندوستان آتے
رہتے تھے۔

[1] ہماری داستان، دارالکلام، قادر سلطان، لاہور، ص ۴۱

سر ٹامس رو ۱۶۱۵ء

تجارت کی غرض سے پرتگیزوں کے ساتھ ولندیز اور انگریز بھی آ شامل ہوئے۔ پرتگیزوں کو دربار جہانگیر میں بہت رسائی حاصل تھی اور وہ بارسوخ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔

۱۶۰۹ء میں جہانگیر کے عہد میں ولیم ہاکنز انگلستان کے بادشاہ کی طرف سے بطور سفیر یہاں بھیجا گیا۔ چونکہ وہ برطانوی تھا اس لیے پرتگیزوں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ یہاں تک کہ پادری جیروم زیویر سمیت سب کی یہی کوشش تھی کہ انگریزوں کے یہاں قدم نہ جمنے پائیں۔ ہاکنز بھی اُن کے اس غلط رویہ کا شکار ہو گیا۔ اور اُسے واپس انگلستان جانا پڑا۔ اس کے باوجود انگریزوں کی آمد و رفت کا سلسلہ تو قائم تھا مگر اُن کے پاس کوئی اجازت نامہ نہ تھا۔ جیمز اول شاہ انگلستان نے اپنے ایک نہایت قابل سفیر سر ٹامس رو کو ۱۶۱۵ء میں ہندوستان بھیجا۔ ٹامس رو ہاکنز کی نسبت قابل اور جاذب نگاہ شخصیت کا حامل تھا بلکہ اُمرا میں سے تھا۔ اُس نے ایک واقعہ کے ذریعہ جہانگیر کے دربار میں عزت حاصل کر لی۔ ہوا یوں کہ شاہی محل کی ایک خاتون بیمار ہو گئی۔ بہت علاج معالجہ کے باوجود کچھ افاقہ نہ ہوا۔ بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ سر ٹامس رو نے اپنے ذاتی معالج سے اس کا علاج کروا دیا۔ اس عورت کی صحت یابی کا سن کر بادشاہ حیرت زدہ ہوا اور اس کی بابت جاننے کی خواہش ظاہر کی۔ سر ٹامس رو کو بلوا بھیجا اور اس قدر خوشی کا اظہار کیا کہ اُسے انعام و اکرام سے نوازنا چاہا۔ سر ٹامس رو ایسے ہی اچھے موقع کی تلاش میں تھا۔ جھٹ اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ کیونکہ وہ اسی غرض سے بھیجا گیا تھا۔

اس سفیر نے عرض کی" آپ کی عنایات اس سے قبل بھی بہت ہیں۔ ایک اور عنایت کا محتاج ہوں۔ اگر وہ پوری ہو جائے تو صرف مجھے ہی نہیں بلکہ میری

پوری قوم کو مستفید ہونے کا موقع میسر آئے گا۔ انعام و اکرام کی بجائے انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کو پروانۂ تجارت حاصل ہو گیا۔ انگریزوں نے تجارت کی وساطت سے اتنی ترقی کی کہ بمبئی، مدراس، اور کلکتہ میں کوٹھیاں قائم کر لیں۔ اس طرح انگریزوں کا اثر و رسوخ یہاں تک بڑھا کہ ان کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ خوش قسمتی ان کی یاوری کر رہی تھی۔ ادھر پرتگیزوں سے ایک ناقابلِ تلافی غلطی سرزد ہوئی کہ مکہ سے حاجیوں کو واپس لانے والا جہاز ان کے ہتھے چڑھ گیا۔ آنے جانے کا پروانہ دکھانے کے باوجود پرتگیزوں نے انہیں لوٹا اور قیدی بنا لیا۔ جہانگیر کو جب اس حرکتِ بد کا علم ہوا تو پرتگیزوں کا محاصرہ کرنے اور ان کا مال ضبط کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ پادری زیویئر کو بھی قید کر لیا گیا۔ اس واقعے سے انگریزوں کو پرتگیزوں پر فوقیت حاصل ہو گئی۔ بادشاہ نے یہ بھی چاہا کہ پرتگیزی اثر و رسوخ پہلے کی نسبت کم ہو جائے۔ اس طرح سمندری برتری بھی انگریزوں کے ہاتھ آ گئی۔

زباندانی کے لحاظ سے بھی جہانگیر انگریزوں کو زیادہ پسند کرنے لگا۔ سر ٹامس رو کا ہندوستان آنا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے مراعات حاصل کرنا مسیحیت کے لئے ایک سنگِ میل ثابت ہوا اور اس اجازت نامہ کے حصول کی وجہ سے انگریز مشنری بھی ہندوستان آنا شروع ہو گئے۔ یوں مسیحیت کو ایک تازہ ولولہ میسر آ گیا۔

سر ٹامس رو نے تین سال تک ہندوستان میں قیام کیا۔ اس مختصر قیام کے دوران اس نے اپنے لئے کچھ نہ مانگا لیکن اپنی قوم، ملک اور مسیحیت کے لئے ایک ایسا کام کر گیا جو تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

اسی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے اس اجازت نامہ کی بنا پر ہندوستان میں

ضبوط بنیادوں پر قدم جمائے اور انگریز تقریباً دو سو برس تک اس ملک پر حکومت کرتے رہے۔ دنیا کی اور نوآبادیوں کو فتح کرنے کے بعد انگریزوں کا مقولہ مشہور ہوا کہ ''سلطنت برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا''۔

کلیسیائے لاہور

اکبر اعظم اور جہانگیر دونوں بادشاہوں کی فراخ دلی کی بدولت لاہور کی کلیسیا قائم ہوئی۔ اس کا ذکر ابتدائی سطور میں آ چکا ہے۔ انہوں نے لاہور کو خاص زینت بخشی۔ اکبر بادشاہ نے ۱۵۸۴ـ۱۵۹۸، یعنی پندرہ برس تک لاہور میں قیام کیا اور لاہور کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ شاہی قلعہ کی نہ صرف مرمت کروائی بلکہ اس کو مزید پختگی دی۔

انجمن یسوع کے مبلغین ۱۵۹۵ء میں جب تیسری دفعہ گوا سے لاہور آئے تو انہیں انجیلی بشارت کی اجازت مل گئی۔ لاہور کی عظمت وجلالت کی وجہ سے اس کو خوبصورت عمارتوں، باغات اور محلات سے مرصع کیا گیا۔ اکبر اعظم کے زمانہ میں یہاں ایک گرجا گھر بھی تعمیر کیا گیا جس کی تعمیر میں جہانگیر نے چار ہزار روپیہ سے مدد کی۔ بہت سارے غیر مسیحی اس گرجا گھر کو دیکھنے آتے رہے۔

پادری زیویئر اور مین ہیرو بھی لاہور کی کلیسیا میں کافی دلچسپی لیتے رہے اور خدمت کا کام سرانجام دینے میں کافی خذمد سے کام لیتے رہے۔ اسی عہد میں اُمرائیں سے معدودے چند ان کی خدمت، نمونہ خدمت اور خلوص سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش مسیحیت ہو گئے۔ ایک امیر گھرانے کا شخص اپنے نوزائیدہ بچے کو لے کر گرجا گھر میں آیا اور قربانگاہ کے قریب لا کر درخواست کی کہ اسے بپتسمہ دیا جائے۔ بپتسمہ لینے والے نومریدوں کی زیادہ تعداد نچلے طبقہ کے لوگوں پر مشتمل تھی۔

کلیسیا کی اس سے بہتر تصویر اور منظر شاید کسی جگہ نہ مل سکے۔ لیکن

قارئین کو اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ یہ تصویر صرف اکبری اور جہانگیری دور سے تعلق ہے۔ ان دنوں میں لاہوری مسیحیوں کو جلوہ ملاحظہ ہو۔

۱۵۹۸ء[۱] میں اکبر بادشاہ کے دور میں عید ولادت مسیح کے موقع پر ایک ڈرامہ کھیلا گیا جو فارسی زبان میں تھا۔ یاد رہے کہ مغل زمانہ میں حکومت میں فارسی زبان رائج تھی۔ اس ڈرامہ کو دیکھنے کے لئے ہزاروں ہندو اور مسلمان موجود تھے۔ کیونکہ اس ڈرامہ میں چرواہوں اور فرشتوں کے کردار ہندو اور مسلمان بچے ادا کر رہے تھے۔

۱۵۹۹ء میں چند اچھے گھرانوں کے ہندوؤں نے عید پنتکست کے بعد بپتسمہ لیا۔ پھر مسیحی لوگ جلوس کی شکل میں لاہور کے گلی کوچوں میں سے گزرے جن پر پھول نچھاور کئے گئے۔ یہ جلوس باجوں کی ہمراہی میں گرجا گھر پہنچا۔

پن ہیرو قسیس جب پہنچے وہاں کھڑا تھا۔ غیر مسیحیوں کا ہجوم اس کا وعظ سننے کے لئے امڈ آیا۔ ایک پندرہ سالہ مسلم لڑکی نے وعظ سے متاثر ہو کر بپتسمہ کے لئے اصرار کیا۔ اس کے والدین نے اس کے اس اقدام پر اسے گھر سے نکال دیا۔ پن ہیرو نے اسے اپنے ہاں پناہ دی۔ اس کے ساتھ ایک برہمن کو بھی انہی ایام میں بپتسمہ دیا گیا۔ اسے بہت زدوکوب کیا گیا کہ وہ پھر بت پرستی کی طرف مائل ہو مگر اس کے مسیحی ایمان میں ذرہ بھر لغزش نہ آئی۔

اسی عہد حکومت میں مسیحیوں کے لئے قبرستان کی منظوری دی گئی۔ جب کسی مسیحی مرد یا عورت کا جنازہ اٹھانا مطلوب ہوتا تو اسے نہایت عزت و احترام سے دفن کیا جاتا تھا۔

اکبر اور جہانگیر الوہیت مسیح اور تثلیث کے عقیدوں کو کبھی سمجھ نہ پائے۔

---

۱ مغلیہ سلطنت اور مسیحیت، برکت اللہ، پی۔آر۔بی۔ایس ص ۲۹۶_۳۰۲

بلکہ اکثر ان پر تنقید کیا کرتے تھے۔

پادری جیروم زیویئر کے ذریعہ شاہی خاندان میں سے چند ایک نے مسیحیت کو قبول کر کے بپتسمہ لیا۔

پادری موصوف نے دونوں بادشاہوں کے لئے کتابیں بھی تصنیف کیں اور بعد ازاں اُن کے ترجمے فارسی زبان میں گئے۔

۱۔ داستان حضرت عیسیٰ۔ جس میں مسیح خداوند کے معجزات، تعلیمات اور زندگی کی تفصیل درج ہے۔

۲۔ چشمۂ حیات۔ یہ کتاب جہانگیر بادشاہ کے لئے لکھی گئی اور الوہیت مسیح کو بالتفصیل بیان کیا گیا۔

۳۔ احوال حواریان حضرت عیسیٰ۔ اس میں مسیح خداوند کے شاگردوں کے حالات زندگی درج ہیں۔

۴۔ اناجیل کے ترجمے:۔ فارسی ترجمے شامل ہیں۔

۵۔ تاریخ شہدا اور مقدسین مقدسین کی شہادت کا ذکر ہے۔

مسیحی مبلغین کے تعلقات جو اکبر بادشاہ سے تھے اُن کو اکثر سراہا جاتا رہا۔ مگر جہانگیر پرتگیزوں کی غلط حکمت عملی کی بنا پر بدظن ہو گیا۔ اور اس قدر برہم رہا کہ پرتگیزوں کے لئے اُس کے دل میں کبھی جگہ نہ بن سکی۔ بلکہ جہانگیری دور میں اور اس کے بعد انہیں ہندوستان میں پھر کبھی وہ مراعات جو حاصل تھیں دوبارہ میسر نہ آسکیں اور وہ صرف گوا، دیو اور دمن تک محدود ہو کر رہ گئے۔ اُن کا یہ خواب کہ ہم ہندوستان کی تجارت پر چھا جائیں گے اور یہ ملک ہماری عملداری میں آجائے گا کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ یہ اعزاز، شرف اور عزت خداوند نے انگریزوں کو ودیعت فرما دی۔ جن کا طوطی بعد ازاں پورے ہندوستان میں دو سو برس تک بولتا

رہا۔ تمام راجے مہاراجے ان کے مطیع رہنے کو ترجیح دیتے رہے۔ اور یوں انگریزی سرکار کا حکم چلتا رہا۔

شاہ جہان (شاہجہان)

اس مغل فرمانروا نے ۱۶۲۷ء۔ ۱۶۵۸ء تک ہندوستان پر بڑے تزک و احتشام سے حکومت کی۔ اسے انجینئر بادشاہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے دور کو مغلیہ سلطنت کے سنہری دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر اسے عالیشان عمارات کا دور کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ روضہ تاج محل اس کی ملکہ ارجمند بانو بیگم جسے ممتاز محل کا لقب دیا گیا کا مقبرہ ہے۔ یہ دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا ہے اور اس دور کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

یہ بادشاہ اگرچہ مختلف مذاہب کی بابت واقفیت رکھتا تھا مگر وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ اس کے عہد حکومت میں ہگلی کے مقام پر پرتگیزوں اور مسلمانوں میں جھڑپ ہوگئی۔ پرتگیزوں نے جو زیادتی کی بادشاہ کو اس کی اطلاع دی گئی۔ بادشاہ غضبناک ہوا۔ اور پرتگیزوں کی بستی تباہ کر دی گئی۔ بہت سے پرتگیز مارے گئے۔ ان اسیروں کو جنہیں آگرہ لایا گیا بابل کی اسیری یاد آگئی۔ بعض کو اسلام قبول کرنا پڑا۔ ہگلی میں گرجا مسمار کر دیا گیا۔ اس واقعہ نے اس عہد میں مبلغین کی وقعت کو کم کر دیا۔ کیونکہ بادشاہ نہ صرف اُن کو ناپسند کرتا تھا بلکہ حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کا اثر لاہور، دہلی، اور آگرہ کی کلیسیا کے لئے زوال کا باعث بن گیا۔ تبلیغ جاری رہی مگر ہندوؤں کے علاوہ کوئی مسلمان مسیحیت کو قبول نہ کر سکا۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں۔

۱۔ مسلمان خداوند یسوع کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ تو مانتے ہیں۔ مگر انہوں نے خداوند کو نجات دہندہ ماننے کی کوشش نہ کی۔

۲۔ ان کی اپنی حکومت تھی اور بادشاہ مذہبی دلچسپی رکھتا تھا۔

ایسے دور میں کوئی مسلمان کیسے اسلام ترک کر کے مسیحیت قبول کر سکتا تھا۔

اس دور میں مقامی مسیحی وہ تھے جو فوج میں ملازم تھے۔ جو چھوٹے چھوٹے کاروبار اور پیشوں سے منسلک تھے۔ کسی مذہب نے بھی کبھی ترقی نہیں کی جب تک کہ حکومت یا بادشاہ نے اس کی سرپرستی نہ کی۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ روم تین صدیوں تک مسیحیت کو مٹانے پر تلا رہا۔ مگر جب ۳۲۵ء میں کانسٹنٹائن نے مسیحیت قبول کر لی تو پچیس سالوں کے اندر اندر روم میں حیرت انگیز انقلاب برپا ہوا۔ رومیوں نے نہ صرف مسیحی مذہب قبول کر لیا بلکہ روم مسیحیت کا ایک زبردست گڑھ بن گیا۔ اس مغل شہنشاہ کے دور حکومت میں لاہور میں اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر مسیحی مبلغین پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ ۱۶۳۱ء میں پادری ڈے کاسترو نے لاہور کی جائیداد کو فروخت کر دیا۔

مغلیہ فوج میں جو مسیحی تھے وہ اس پادری صاحب کے اس رویہ سے گھبرا کر موقع محل کے مطابق حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

اورنگ زیب عالمگیر

اورنگ زیب کو مغلیہ سلطنت کا آخری بادشاہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد سلطنت زوال پذیر ہو گئی۔ اس کی سلطنت کا عرصہ حکومت ۱۶۵۸ء۔ ۱۷۰۷ء ہے۔ وہ کٹر سنی تھا اور اشاعت اسلام کا دل سے خواہاں تھا۔

اس کے عہد میں دکن میں دو ریاستیں بیجاپور اور گولکنڈہ شیعہ عقیدہ سے وابستہ تھیں۔ اس لئے ۲۶ سال تک اُسے مذہبی جنون کی وجہ سے ان ریاستوں سے برسرپیکار رہنا پڑا۔ اس دکنی پالیسی سے اس کی سلطنت اس کی زندگی ہی میں کمزور ہو گئی

اورنگ زیب نے اپنے دور میں قانون نافذ کیا کہ کوئی مسلمان کسی دوسرے مذہب کو اختیار نہ کرے۔ اسی قانون کے حوالے سے منوچی MANUCCI رقمطراز ہے کہ "اڑتالیس سالوں میں ایک بھی مسلمان کو مسیحیت اختیار کرتے نہیں دیکھا گیا۔ مبلغین کو اجازت نہ تھی کو وہ مسیحیت کی اشاعت کریں اور مسلمانوں کے ساتھ میل جول رکھیں۔ اس عہد میں عوام یعنی غیر مسلموں پر جزیہ کا اطلاق بھی ہوا۔ صرف ڈونا جولیانہ جو گوا کے مسیحی خاندان سے تعلق رکھتی تھی وہ بیجاپور کے محاصرہ کے بعد دارالخلافہ میں پائی گئی تھی۔ کیونکہ وہ شاہی دربار میں ملازمہ تھی۔ اس کی کوشش سے مبلغین سے جزیہ کی وصولی معاف ہوگئی۔

اس بادشاہ کے عہد میں کلیسیائے ہند کی ترقی کے تمام راستے مسدود ہو کر رہ گئے۔ اور تمام صوبوں میں کلیسیا تنزل کا شکار ہوگئی۔ صورت حال یہ ہوئی کہ مسیحی لوگ چھپ چھپ کر گھروں کی نچلی منزل میں عبادت کرتے تھے۔

۱۷۱۴ء میں پادری ڈیری DERI لاہور آیا تو یہاں پانچ چھ مسیحیوں سے زیادہ نہ تھے۔

اُن اسباب کو زیر بحث لانے کی ضرورت ہے جو کلیسیائے ہند کے زوال کا سبب بنے۔ وہ کلیسیا جو اکبر اعظم کے وقت کافی مضبوط ہوتی جارہی تھی اور تقریباً سارے ہندوستان میں پھیلتی جارہی تھی۔ کیا اسباب تھے جو اس کے زوال کا باعث بن گئے۔ اور لاہور جیسے بارونق شہر میں مسیحی صرف پانچ چھ کی تعداد میں بقیہ کے طور پر رہ گئے۔

ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اُس وقت سلطنتِ مغلیہ بھی زوال کے پھیلے ہوئے دامن میں سمٹ رہی تھی۔ اسی لیے یہ زبردست سلطنت ۱۷۰۷ء کے بعد قائم نہ رہ سکی۔ اس کے اسباب زوال کلیسیائی تنزل کے شانہ بشانہ دیکھے جاسکتے

۱۔ اورنگ زیب کے بعد اُس کے بیٹوں میں تخت کے لیے جنگ چھڑ گئی کیونکہ مغلوں میں تخت نشینی کا کوئی اصول وضع نہ کیا گیا تھا۔ اور یہ بادشاہ شکی مزاج ہونے کی وجہ سے اپنے بچوں کے لیے کوئی اصول مرتب نہ کر سکا۔

۲۔ احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ دُرانی کے حملوں نے اس سلطنت کی رہی سہی ساکھ کو خاک میں ملا ڈالا۔

۳۔ اورنگ زیب کی کٹر مذہبی پالیسی نے بہت سارے ہندوؤں، سکھوں، جاٹوں، مرہٹوں اور راجپوتوں کو اس کا مخالف بنا دیا تھا۔ وہ شیعہ فرقے کے لوگوں کو اور اُن کی دکنی سلطنت کو بھی برداشت نہ کرتا تھا۔ نتیجتاً اُس کی موت کے فوراً بعد سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔

۴۔ سلطنت کی وسعت، جنگوں میں متواتر مصروف رہنا اور شہزادوں کا سلطنت کے کاموں سے بے دخل رہنا۔ بھی زوال کا باعث بنا۔

کلیاؤں کے زوال کے اسباب

۱۔ اسلامی حکومت میں جب بھی رواداری کا مظاہرہ کیا گیا عوام الناس دائرہ مسیحیت میں آتے رہے۔ اور مسیحی مذہب کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے رہے۔ لیکن جب اورنگ زیب جیسا کٹر مسلمان بادشاہ آجاتا تو مسیحی پرچار پر قدغن لگ جاتی تھی اور ترقی کے راستے بند ہو جاتے تھے۔

۲۔ جہانگیر کے عہد میں اور اس کے بعد سے مغربی اقوام سمندری تجارت میں سبقت لے گئیں۔ اور اس دوڑ میں دوسروں پر برتری حاصل کرنے کے لئے کوششیں تیز تر کر دیں۔ پرتگیزوں، ولندیزوں اور فرانسیسیوں کے قیام کے دوران مسیحی ان کے زیر سایہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ لیکن جب وہ اپنے وطن

واپس چلے جاتے تو مسیحیوں کی حالت دگرگوں ہو جاتی تھی۔ بلکہ وہ کو... ...

بھٹکتے پھرتے تھے۔

۳۔ غیر ملکی مسیحیوں کی زندگیاں بھی روحانی، مثالی اور اخلاقی نہ ...

تھیں۔ بسا اوقات ان کی بداعمالیاں دوسرے مذاہب کے لوگوں کی ...

مات کر دیتی تھیں۔ یہی وجہ مسیحی اُن کی زندگیوں سے روحانی تقویت حاصل ...

سے محروم رہے۔ اور ان حالات سے بدظن ہو کر نو مرید مسیحی اپنے مذہب میں واپس

لوٹ جاتے تھے۔

۴۔ بدیسی لوگ صرف تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔ اور

جب تجارت کو فروغ ملا تو انہوں نے یہاں پر اپنی کوٹھیاں قائم کر لیں اور ہندوستانی

راجوں سے لڑائیاں مول لے کر چند ایک ریاستوں پر قبضہ بھی کر لیا۔ اس طرح ان

کی توجہ زیادہ تر ہوسِ زر کی طرف ہو کر رہ گئی تھی۔ تبلیغی کاموں کی طرف بہت ...

چند لوگ ہی ہوا کرتے تھے۔ پادری ٹیری REV. TERRY جو انگریز

سفیر سر ٹامس رو کے ساتھ ہندوستان آیا اس نے لکھا ہے کہ:۔

''میری دلی آرزو ہے کہ میں اہلِ اسلام کو انجیلِ جلیل کی بشارت دوں

لیکن کیا کروں ہمارے مسیحیوں کی زندگیاں ہی ایسی ہیں کہ سب کیئے کرائے پر پانی

پھر جاتا ہے۔ اور سب کچھ خاک میں مل جاتا ہے''

۵۔ ہندوستان میں زیادہ تر نچلے طبقوں نے مسیحیت اختیار کی تھی۔ مذہب

اور ایمان کی تبدیلی کے بعد ضرورت اس اَمر کی ہوتی ہے کہ اُن کو روحانی اور

اقتصادی لحاظ سے مضبوط کیا جائے۔ لیکن اسکا ہمیشہ فقدان رہا۔ یہ تبدیلی اُن کی

زندگیوں میں تبدیلی نہ لا سکی۔ اکثر حالتوں میں وہ دونوں طرف سے پریشان ہو

جاتے تھے۔ تبدیلی مذہب اکثر جھگڑے کا باعث ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا جب اُن میں

واپس جاتے تو مذمت اور تنقید سے کام لیا جاتا تھا۔ دوسری طرف ان کی حوصلہ افزائی نہ ہوا کرتی تھی۔ وہ لوگ جو کول، دراوڑ اور دولت ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے انہیں سنبھالا دینے کے لئے خود مشنریوں یا مبلغین کو قربانیاں تک دینی پڑیں۔ بصورت دیگر تمام ہندوستانی نومرید واپس اپنے اپنے قبائل یا مذہب میں لوٹ جاتے تھے۔

۶۔ مبلغین کے باہمی تنازعے، جھگڑے اور حسد بھی کلیسیائی ترقی میں رکاوٹ کا باعث بنے رہے۔ فرانسس زیویئر، جیروم زیویئر اور روزاریو جیسے مضبوط ایماندار لوگوں کے بعد ان جیسے پھر نہ آئے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ وہ آپس میں جھگڑ پڑتے اور دوسرے کا اپنے علاقہ میں آنا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ باہمی چپقلش نے بشارت کے کام میں بہت رخنہ اندازی کی۔

۷۔ پرتگیز، ولندیزی، انگریز اور فرانسیسی اولاً تجارت اور ہندوستان میں حکمرانی، سیاسی امور اور دیگر باتوں کو زیادہ فوقیت دیتے تھے اور چونکہ ان بدیسی لوگوں کی اپنی زندگیاں خدا سے دور تھیں اسی لیے اس ذاتی غرض نے بشارتی کام کو پس پشت ڈال دیا۔

۸۔ بدیسی لوگ اپنا کام کاج کرنے کے بعد عیش وعشرت کی زندگی گزارا کرتے تھے۔ شراب نوشی، زناکاری اور جوا کھیلنے کے شوق نے ہندو اور مسلمانوں کی زندگی پر بڑا اثر ڈالا۔ پادری ٹیری REV. TERRY کے الفاظ اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ مبلغین کا سب کیا کرایا خاک میں مل جایا کرتا تھا۔

۹۔ مبلغین دیسی لوگوں کو مسیحی تو کر لیتے مگر ان میں پیشواؤں کا ہمیشہ فقدان رہا۔ اکثر دیکھنے میں آیا کہ مسیحیت ہندوستان میں اور بہت دیر بعد پاکستان جیسے خطہ میں بھی ایک درآمدی مذہب IMPORTED

کی صورت اختیار کر گئی۔ اگر شروع ہی میں مسیحیت کو اپنی قیادت نصیب ہو جاتی۔ اُن کے اپنے پادری بشپ اور ماڈریٹر ہوتے تو مسیحیت کا یہ حشر نہ ہوتا۔

۱۰۔ بدیسی مبلغین نے کلیساؤں کے ایمان کو مضبوط اور مستحکم کرنے پر زیادہ توجہ نہ دی اور نہ ہی اچھے معیاری مدرسے کھولے جہاں علم الٰہیات کی تعلیم دی جا سکتی۔ وہ اس خطہ میں رہ کر بھی لاطینی اور پرتگیزی زبانوں میں تعلیم دیتے تھے اور عبادتوں میں انہی زبانوں کو استعمال کرتے تھے۔ یہ ایک فاش غلطی تھی۔ اگر دیسی مسیحیوں کو سنسکرت، عربی اور ہندی میں تعلیم دی جاتی جو اُن کی اپنی زبانیں تھیں تو اس سے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوتے۔

اکبر اعظم کے لئے انجیل کا فارسی ترجمہ تو ضرور کیا گیا مگر عوام الناس کے لئے ہندی ترجمہ کی طرف توجہ نہ دی گئی۔ عبادات میں غیر ملکی رسوم لوگوں کے لئے اجنبی ہونے کی وجہ سے روحانیت کا باعث نہ بن سکیں اور لوگ مسیحی تعلیم اور بنیادی عقائد سے بہرہ ور نہ ہو سکے۔

نومریدوں کے لئے کوئی جائے عبادت نہ تھی۔ اورنگ زیب اور اُس کے جانشینوں کے عہد میں عبادت گاہوں کی مرمت تک کرنا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ کیونکہ مسیحیت کی اشاعت قدغن کی لپیٹ میں تھی۔

روحانی تشنگی اور پیاس کو مٹانے کے لئے کوئی سامان میسر نہ تھا۔ زندگی کی روٹی اور چشموں سے دور کلیسیا کیسے زندہ رہ سکتی تھی۔ ان چیزوں کے فقدان کی شدت سے کلیسیا نے تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیا۔ اور ایسے لوگ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جذب ہوتے چلے گئے۔

اورنگ زیب کی مذہب کی اشاعت پر پابندی اور نادر شاہ اور احمد شاہ

ابدالی کے حملوں کی بدولت بدیسی مبلغین اپنے اپنے ملک سدھارے اور وہ بھی ایسے وقت میں جب کلیسیا اور عوام کو اُن کی سخت ضرورت تھی۔ مسیح خداوند نے فرمایا'' انجیل یوحنا ۱۰: ۱۱-۱۲

'' اچھا چرواہا بھیڑوں کے لئے اپنی جان دیتا ہے۔ مزدور جو نہ چرواہا ہے نہ بھیڑوں کا مالک بھیڑیے کو آتے دیکھ کر بھیڑوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اُسے بھیڑوں کی فکر نہیں ہوتی اور بھیڑیا اُن کو پکڑتا اور پراگندہ کرتا ہے۔''

بدیسی یعنی غیر ملکی چرواہے اپنے فرض سے غافل رہے۔ وہ اپنی جان بچانے کی فکر میں رہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ مرنے تک وفادار رہتے اور تبلیغ و اشاعت کا فرض پورے طور پر نبھاتے۔ اُن کی بے حسی اور کمزوری یا غفلت دیکھ کر ملکی مبلغین نے بھی فرض شناسی نہ سیکھی۔ انہوں نے بھی انجیل کی اشاعت میں جرأت کو نہ اپنایا۔

پاکستان کی کلیسیا کو بھی آج یہ آزمائش پیش آسکتی ہے۔ لیکن خدا کرے کہ کلیسیا کا ہر سپاہی خدا کے کلام کو سُن کر اور اسے اپنے دل میں جگہ دے کر اپنے ہموطنوں کو نجات کا پیغام پہنچائے اور مرنے تک یسوع مسیح اور انجیل کا وفادار رہے۔

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

(غالب)

انگریزوں کا دور

یورپی اقوام کا ہندوستان آنا

پُرتگیز

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد یورپی اقوام نے ہندوستان میں آ... شروع کر دیا۔ ان غیر ملکی لوگوں کی آمد سے پہلے عرب جہاز رانوں اور تاجروں کی بحیرۂ عرب پر اجارہ داری تھی اور یہ عرب تاجر خلیج فارس کے راستے یا بحیرۂ قلزم کے راستے تجارت کیا کرتے تھے اور یوں مال بغداد اور سکندریہ کے راستے وینس پہنچایا کرتے تھے۔ ساتویں صدی ختم ہونے سے پہلے مسلمان عراق، عرب، مصر اور شام پر چھا چکے تھے۔

۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور تمام تجارت جو یورپ سے ہوا کرتی تھی وہ مسلمانوں کے رحم و کرم پر ہونے لگی۔ اس مشکل کا حل تلاش کرنے کے لئے یورپی ممالک نے ہندوستان کا راستہ معلوم کرنے کی سرتوڑ کوششیں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے پرتگیزوں کے جہاز کالی کٹ پہنچے۔ واسکوڈے گاما ۱۴۹۸ء میں راس اُمید کا چکر کاٹ کر کالی کٹ کے سامنے لنگر انداز ہوا۔ پرتگیز رفتہ رفتہ زنجبار، موزمبیق، مسقط، سقوطرہ، گوا، کولمبو اور دکن تک قابض ہو گئے۔ اب کسی کی کیا مجال تھی کہ بحرِ ہند میں اُن کی اجازت کے بغیر کوئی جہاز چلاتا۔

پرتگیزوں کے دو جرنیل فرانسکو ایسڈا اور البوقرق فتوحات کرتے گئے اور ساتویں صدی کے آخر تک پرتگیز مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں گوا،

دیو، دمن پر قابض ہو گئے۔ سترھویں صدی کے شروع میں پرتگیزوں کو زوال آنا شروع ہو گیا۔

ولندیز

۱۶۰۲ء میں ڈچ یا اہل ہالینڈ جو ولندیز کہلاتے ہیں کمپنی بنا کر ہندوستان آ گئے۔ انھوں نے پرتگیزوں کو بحر ہند سے نکال باہر کیا اور جاوا پر قبضہ کر لیا۔ اور ہندوستان اور جاوا میں تجارتی کوٹھیاں قائم کر لیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج

۱۵۸۸ء میں انگلینڈ نے سپین کے جنگی بیڑے کو شکست دی۔ اس فتح نے ان کے حوصلے بلند کر دیے۔ چنانچہ انگریز تاجروں نے ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ اول سے اجازت لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی۔

۱۶۰۸ء میں کیپٹن ہاکنز آیا مگر پرتگیزوں کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ گئی۔ ۱۶۱۲ء میں انگریزوں اور پرتگیزوں کے مابین جنگ ہوئی جس میں انگریزوں کا پلہ بھاری رہا اور وہ سورت پر قابض ہو گئے۔

۱۶۱۵ء میں انگلستان کا مشہور سفیر سر ٹامس رو جہانگیر کے دربار میں آیا اور ایک کارنامہ کی بنا پر اپنے ہم وطنوں کے لئے تجارت کا پروانہ حاصل کر لیا۔ اس نے عرصہ تین سال تک یہاں قیام کیا۔

۱۶۹۰ء میں انگریزوں نے دریائے ہگلی کے کنارے شہر کلکتہ کی بنیاد رکھی اور چھ سال کے بعد کلکتہ میں اپنے بادشاہ کے نام پر فورٹ ولیم نام کا قلعہ بنایا۔

۱۷۶۹ء میں انگریز ولندیزوں کو ہندوستان سے بھگانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ ایسے گئے کہ پھر کبھی آنے کا خیال تک نہ کیا۔

فرانسیسی

ایسٹ انڈیا کمپنی کے عروج کو دیکھ کر فرانسیسیوں نے بھی ایک تجارتی کمپنی قائم کر لی۔ ۱۶۷۴ء میں پانڈیچری کی بنیاد رکھی۔ فرانسیسی ڈوپلے بڑا لائق اور قابل جرنیل تھا۔ اُسے یہاں بھیجا گیا۔ باہمی رقابت کی بنا پر دونوں کمپنیاں آپس میں بھڑ گئیں۔ انگریزوں کی قسمت کا ستارہ چمک رہا تھا۔ فرانسیسی شکست کے بعد اپنے اقتدار سے محروم ہو گئے۔ بلکہ انگریزوں نے ۱۷۶۱ء میں پانڈیچری پر قبضہ کر لیا۔

۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو کلائیو اور نواب سراج الدولہ کے درمیان پلاسی (کلکتہ سے ستر میل دور) کے میدان میں جنگ ہوئی۔ میر جعفر جو نواب کے ساتھ تھا عین لڑائی کے موقع پر انگریزوں سے مل گیا۔ نواب میدان جنگ میں شکست کے آثار دیکھ کر بھاگ نکلا۔ جب پکڑا گیا تو میر جعفر کے بیٹے میرن نے اُسے قتل کر دیا۔

۱۷۶۵ء میں بکسر کی جنگ کے فوراً بعد انگریزوں نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کر لی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا سنگ بنیاد فی الواقع کلائیو ہی نے رکھا تھا۔ اُس کی حکمتِ عملی بہادری اور مستقل مزاجی نے انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی کمپنی کی بجائے حکمران طاقت بنا دیا۔ اور اس طرح وہ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا بانی کہلایا۔

کلائیو کے بعد ہیسٹنگز HASTINGS گورنر بن کر آیا۔ وہ ۱۷۷۳ء سے ۱۷۸۵ء تک یہاں رہا اور بعد میں وہ پہلا انگریز گورنر جنرل بنا۔ اُسے حیدر علی اور مرہٹوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس نے انگریزی حکمرانی کی بنیاد کو مزید مستحکم کیا۔

ہیسٹنگز کے بعد کارنوالس اور پھر ولزلی ۱۷۹۸ء سے ۱۸۰۵ء تک گورنر جنرل رہا۔ وہ بڑا بیدار مغز اور مدبر حکمران تھا۔ اُس کا کارنامہ ہمیشہ تاریخ میں جلی

حروف میں لکھا جائے گا کیونکہ اُس نے کمپنی کو ہندوستان میں افضل ترین طاقت بنا دیا۔ اپنے عہد میں اُس نے ٹیپو، مرہٹوں اور فرانسیسیوں کی طاقت کو کچل کر رکھ دیا۔ حیدر آباد اور میسور کی ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ اور انگریزی سلطنت کو وسعت دی۔

رابرٹس کا کہنا ہے[1] کہ اس کے تقرر پر انگریزی حکومت محض ایک حکومت تھی مگر ولزلی کی واپسی پر انگریزی حکومت ایک سلطنت بن چکی تھی۔

۱۸۰۵ء میں ولزلی کے چلے جانے کے بعد برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی بالا شرکت غیرے ہندوستان کی اکثر ریاستوں پر غلبہ حاصل کر چکی تھی۔

ولزلی کے بعد لارڈ منٹو آیا اور ۱۸۱۳ء میں ایک اہم قانون پاس ہوا۔

منٹو چارٹر ۱۸۱۳ء۔ مسیحی مُبلّغین کو ہندوستان میں آزادیٔ تبلیغ

جہانگیر بادشاہ کے آخری ایام کے بعد مسیحی مذہب کی تبلیغ پر زبردست قدغن تھی۔ اور مسیحیت مشکل مراحل میں سے گزر رہی تھی۔ تبلیغ کرنا تو درکنار مسیحی عبادت گاہوں کا تعمیر کرنا سخت منع تھا۔ کوئی مسلمان مسیحی مذہب اختیار نہ کر سکتا تھا۔

اورنگ زیب کے عہد میں لاہور جیسے پُر رونق شہر میں مسیحیت کا صرف ایک بقیہ رہ گیا تھا۔ لیکن وقت نے پلٹا کھایا۔ انگریزوں کی حکومت میں لارڈ منٹو اول کے وقت ۱۸۱۳ء میں ایک چارٹر کی رو سے پادریوں اور مشنریوں کو ایک تبلیغی اجازت نامہ دے دیا گیا۔ حالانکہ اس سے قبل مسیحی مذہب کی تبلیغ کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

لارڈ منٹو اول کا یہ کارنامہ مسیحیت اور تاریخ کلیسیائے ہندو پاک میں ہمیشہ ایک احسان کے طور پر رہے گا۔ کیونکہ اسی چارٹر نے مسیحیت کے لئے

---

1. P.E. ROBERTS, HISTORY OF INDIA, PAGE 237

ہندوستان میں ایک دفعہ پھر موقع فراہم کیا کہ اس کے مردہ جسم میں جان آجائے۔ اگرچہ اس چارٹر کی منظوری سے پیشتر بھی مشنری یا مبلغین آ رہے تھے مگر اب باقاعدہ پروانہ یعنی اجازت نامہ میسر آ گیا جس کے بعد تمام فرقوں اور بہت سی قوموں کے مبلغین ایک دفعہ پھر مسیحیت کا علم اور محبت کا پیغام جو مسیحیت کی منفرد خوبی ہے لے کر آ گئے۔ ان کی آمد سے قبل دو زبردست مشنری آ چکے تھے۔ جن کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے۔

ولیم کیری۔ پہلا پروٹسٹنٹ مشنری ۱۷۹۳ء

پروٹسٹنٹ فرقہ یا عقیدہ کی ابتداء ۱۵۲۰ء میں ہوئی جب جرمنی میں ایک جرمن پادری مارٹن لوتھر نے پوپ کے احکام کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ اس نے خاص طور پر معافی ناموں کے خلاف زبردست آواز بلند کی۔ یہ معافی نامے جرمنی اور یورپ میں پوپ کی طرف سے دیئے گئے اختیار کی بدولت فروخت کیئے جا رہے تھے۔ مارٹن لوتھر نے زبردست مخالفت کی۔ اُسے اس احتجاج کی وجہ سے جان سے مار دینے کی دھمکی بھی دی گئی۔ اور اُسے واجب القتل قرار دے دیا گیا۔ مگر جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کی ابتداء ہو چکی تھی۔ اور آہستہ آہستہ یہ تحریک پورے یورپ میں پھیل گئی۔

پوپ کے خلاف انگلستان میں بھی نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ یہ نفرت اس قدر سنگین تھی کہ لوگ جنہوں نے پروٹسٹنٹ عقیدہ اپنا لیا رومن کیتھولک لوگوں کو دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ یورپ کے بادشاہ ایک دوسرے کے خلاف ہو گئے۔ فرانس اور سپین والوں نے پوپ کا ساتھ دیا۔ جبکہ انگلستان والوں نے نہ صرف پروٹسٹنٹ فرقہ کی حمایت کی بلکہ ایک الگ چرچ کی بنیاد رکھی۔

چرچ آف انگلینڈ

الزبتھ اول نے انگلستان میں ۱۵۵۸ء میں چرچ آف انگلینڈ کی بنیاد رکھی۔ اور یوں وہ رومن کیتھولک چرچ سے آزاد ہو گئے۔ اس نئے چرچ کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ لہٰذا یہ چرچ اور اس کے مشنری دُنیا کے اکثر حصوں میں پھیلتے چلے گئے۔ اُنہوں نے ہندوستان کا بھی رُخ کیا۔ یہاں ایک بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ آج پاکستان میں تمام بڑی بڑی عبادت گاہیں یعنی گرجے اسی دور کی یادگار ہیں۔ برٹش راج جہاں بھی گیا وہاں انہوں نے عظیم اور عالیشان گرجے ضرور بنائے۔

چارلز ۱۸۱۳ء سے پہلے انگلستان سے آنے والے پروٹسٹنٹ مشنری ولیم کیری WILLAM CAREY تھے۔ وہ کلکتہ کے پاس سرامپور کے مقام پر آئے۔ پیشہ کے لحاظ سے وہ جوتے بنایا کرتے تھے۔ لیکن خیال غالب ہے کہ چونکہ ۱۸۱۳ء سے قبل ہندوستان میں مشنریوں کو تبلیغ کی اجازت نہ تھی اس لئے انہوں نے جوتوں کی تجارت کا سہارا لے کر یہاں آنے کی اجازت حاصل کی اور سرامپور ۱۷۹۳ء میں آ کر ٹھہرے۔ آغاز میں اُن کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اُن کے دل میں ایمان کی شمع روشن تھی، ولولہ اور جوش موجزن تھا۔ وہ اصطباغی چرچ BAPTIST CHURCH سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اس چرچ کی بنیاد اُن ہی کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ اس لئے انہیں پہلا BAPTIST بپٹسٹ اور پہلا پروٹسٹنٹ مشنری کہا جاتا ہے۔

سرامپور میں ولیم کیری نے ایک چھاپہ خانہ قائم کیا اور اس طرح پہلی بار انجیل جلیل کا ترجمہ جدید طریقوں پر یعنی پرنٹنگ پریس سے چھاپا گیا۔ آپ نے غالباً کئی زبانوں میں انجیل کے حصوں کا ترجمہ چھپوا کر مسیحیت کا پیغام دوسروں تک

پہنچایا۔ ۱۸۳۴ء میں اپنے خداوند سے جاملے اور ایک نیک مقصد کی بدولت اس دارفانی میں نام چھوڑ گئے۔

ولیم کیری کے بعد آنے والے دوسرے نامور مشنری ہنری مارٹن تھے۔

ہنری مارٹن ۱۸۰۵ء

مسیحی محاذ کا ایک اور زبردست سپاہی جس کا نام ولیم کیری کے ساتھ تاریخ کلیسیائے پاک وہند میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا وہ ہنری مارٹن ہے۔ وہ ۱۸۰۵ء میں انگلستان سے یہاں آیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں بحیثیت ایک چیپلین کے خدمت شروع کی۔ ہنری مارٹن خداداد قابلیت کا مالک تھا۔ اُس نے پہلی مرتبہ نئے عہد نامہ کا فارسی اور ہندی میں ترجمہ کیا۔ ایڈورڈ مور کے کہنے کے مطابق ۱۸۱۰ء تک وہ کانپور میں رہا۔ وہاں اُس نے نہایت محنت شاقہ سے ہندی اور فارسی سیکھی۔ کانپور میں بازاری منادی کے دوران ایک شخص شیخ صالح جو دہلی سے تعلق رکھتا تھا اور پیشہ کے لحاظ سے جوہری تھا مارٹن سے ملا۔ اُس نے اُن سے دوستی کر لی۔ اگلے سال ۱۸۱۱ء میں اس نے پادری ڈیوڈ براؤن کے ہاتھوں کلکتہ کے پرانے گرجا گھر میں بپتسمہ لیا۔ مسیحی نام عبدالمسیح رکھا گیا۔ اُس نے بعد میں ہنری کے ساتھ مل کر ہندی اور فارسی میں نئے عہد نامہ کا ترجمہ کرنے میں بڑی مدد کی۔ مذکورہ نومرید مسیحی عبدالمسیح ہندوستان میں سی۔ ایم۔ ایس (C-M-S) کا پہلا کارندہ اور پہلا خادم الدین تھا۔ وہ دورِ جدید میں مسلمانوں میں سے پہلا شخص تھا جو خادم دین مقرر ہوا۔

ہنری مارٹن کے دل میں ایک تڑپ تھی کہ وہ نئے عہد نامہ کا ترجمہ عربی زبان میں بھی کرے۔ بس وہ فارس سے ہوتا ہوا عراق چلا گیا۔ اُس نے بڑی محنت سے عربی زبان سیکھی اور اس میں دسترس حاصل کر لی اور نئے عہد نامہ کا عربی

زبان میں انتہائی خوبصورت ترجمہ کیا۔ بابل کے اس مقام کے نزدیک جہاں سکندرِ اعظم نے وفات پائی تھی۔ خدا کا یہ نامور خادم مشکلات برداشت کرتا اپنے ترجمہ اور منادی کے مبارک کام کو نبھاتا ہوا ۳۲ برس کی عمر میں جو عین شباب کی عمر تھی ۱۸۱۲ء میں توخت کے مقام پر وفات پا گیا۔

اس جوان عمر میں خداوند کے پاس چلے جانا یقیناً اس بات کو ثبوت ہے کہ وہ خداوند کو بہت پیارا تھا۔ وہ جب تک جیتا رہا خداوند کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

لارڈ ولیم بینٹنگ ۱۸۲۸ء۔۱۸۳۵ء

چند ایسی شخصیات جو انگریزی سلطنت میں سربراہ ہونے کی حیثیت سے وارد ہوئیں جنہوں نے مسیحی تبلیغ تو کبھی نہ کی لیکن اُن کی زندگی کا مسیحی نمک اور نور ہمیشہ اُن کے دور میں اُجاگر رہا۔ اُن میں سے انگلستان سے ۱۸۲۸ء میں ہندوستان آنے والا گورنر جنرل ولیم بینٹنگ تھا۔ اُس نے مسیحیت کی تعلیم کو اپناتے ہوئے اپنے دور میں ایسے سماجی کام کیئے جو بنی نوع انسان سے پیار کا واضح ثبوت ہیں۔

ستی کی رسم

ولیم بینٹنگ نے ہندوستان سے ستی کی رسم ختم کرنے کے لئے پہلی بار قدم اُٹھایا اور اس اخلاقی اور انسانی گراوٹ کو بدعت قرار دیا۔ یہ رسم ہندوؤں میں پائی جاتی تھی اور ہندو عورت کو بیوہ ہونے کی صورت میں اپنے خاوند کی ارتھی کے ساتھ زندہ جل مرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اس رسم کا بنگال میں بڑا زور تھا۔ نہ جانے کتنی عورتوں کو اس گھنونی رسم کی بدولت زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔

۱۸۲۹ء میں ایک قانون نافذ کر کے اس رسم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔

دختر کشی کا اِنسداد

ایک دوسری بری رسم راجپوتوں میں رائج تھی کہ وہ بیٹی کی پیدائش کو برا تصور کرتے اور بیٹی کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ ولیم نے اس رسم کو بھی ختم کر دیا۔

اِنسانی قُربانی کا اِنسداد

اڑیسہ کی وحشی اور جنگلی قوموں میں انسانی قربانی کی رسم رائج تھی۔ ولیم بینٹنک نے اسے ختم کر کے انسان کشی بند کرائی اور مسیحیت میں پائی جانے والی محبت کا ثبوت فراہم کیا۔

انگریزی کو ذریعہ تعلیم رائج کرنا

انگریزی زبان ہی نئے زمانہ کے تقاضوں پر پوری اُتری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر موجد اور محقق انگریزی تھے۔ ۱۸۳۳ء میں ایک قانون منظور کیا گیا جس کا روحِ رواں ایک ماہر تعلیم میکالے MACAULAY تھا۔ اُس کی تجویز کو سراہا گیا۔ اور فیصلہ ہوا کہ آئندہ ہندوستان میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگی اور انگریزی ہی کو دفاتر میں فارسی کی جگہ استعمال کیا جائے گا۔

یہ گورنر جنرل اپنے دور میں ایسی اصلاحات کر گیا کہ اُسے برٹش گورنمنٹ ان انڈیا میں ایک بہت بڑا مصلح گنا گیا۔ ان اصلاحات میں ایک ہندو شخصیت یعنی راجا رام موہن رائے نے جو بنگال کے زبردست ریفارمر تھے بہت مدد کی۔

دراصل مسیحی تعلیم کا بنیادی کام یہی رہا ہے کہ وہ دُنیا سے جہالت، بے انصافی اور ظلم کا خاتمہ کرے اور اُن عوام کا جن کا کوئی پُرسان حال نہ ہو وکیل بن جائے۔ خوش



منظور مسیح کو ۵ اپریل ۱۹۹۴ء میں قانون رسالت میں ملوث کرنے کے بعد نامعلوم افراد نے شہید کر دیا گیا۔ اس کی قبر (واقع گورا قبرستان جیل روڈ لاہور) کو کیتھیڈرل ہائر سیکنڈری سکول لاہور کینٹ کے طلبا وطالبات اور سٹاف نے پختہ کروایا ہے۔

قسمتی یہ ہے کہ ولیم بینٹنک نے بھی کچھ کیا۔

پنجاب اور سندھ کا الحاق

کلیسیائے پاکستان کی تاریخ پر صحیح غور کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ سندھ اور پنجاب کب انگریزوں کی عملداری میں شامل ہوئے۔ کون سے لوگ تھے جنہوں نے ان علاقوں کو فتح کیا۔ ان علاقوں یا صوبوں میں کون لوگ حکمران تھے۔

مہاراجا رنجیت سنگھ سکھ سردار تھا۔ اور ایسا سردار سکھوں میں پھر کبھی نہ پیدا ہوا جس نے سکھوں کو یگانگت کے بندھن میں اس طرح سے ایک دوسرے کے قریب کر دیا کہ ایسا پھر دیکھنے میں نہ آیا۔ سکھوں میں بہت سے راجے حکومت کرتے رہے مگر جو شان وحشمت اس راجے کو نصیب ہوئی کسی دوسرے کے نصیب میں نہ تھی۔

مہاراجا رنجیت سنگھ ۱۷۸۰ء میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں چیچک کے باعث ایک آنکھ بصارت سے محروم ہوگئی تھی۔ یہ اپنی مثال آپ تھے۔ کسی دوسرے سکھ راجے کو ان کا نعم البدل نہیں کہا جا سکتا۔ ۱۷۹۹ء میں اس نے لاہور پر قبضہ کر لیا تھا۔

۱۸۰۹ء میں لارڈ منٹو نے رنجیت سنگھ سے ایک معاہدہ کیا کہ وہ پنجاب کا حکمران ہوتے ہوئے ستلج کے پار نہیں آئے گا۔ اسے معاہدۂ امرتسر کا نام دیا جاتا ہے۔ جس کی رو سے دریائے ستلج انگریز اور سکھ حکومتوں کی سرحد ٹھہرا۔ مہاراجا رنجیت نے اس معاہدہ کی پوری پوری پابندی کی۔ اور کسی موڑ پر اپنے وعدے سے نہ پھرا۔ لیکن دوسری طرف پشاور، اٹک، کشمیر، ہزارہ، بنوں، ڈیرہ جات اور ملتان فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے۔ وہ پنجاب اور کشمیر کا بلا شرکت غیرے ایک

زبردست حکمران رہا۔

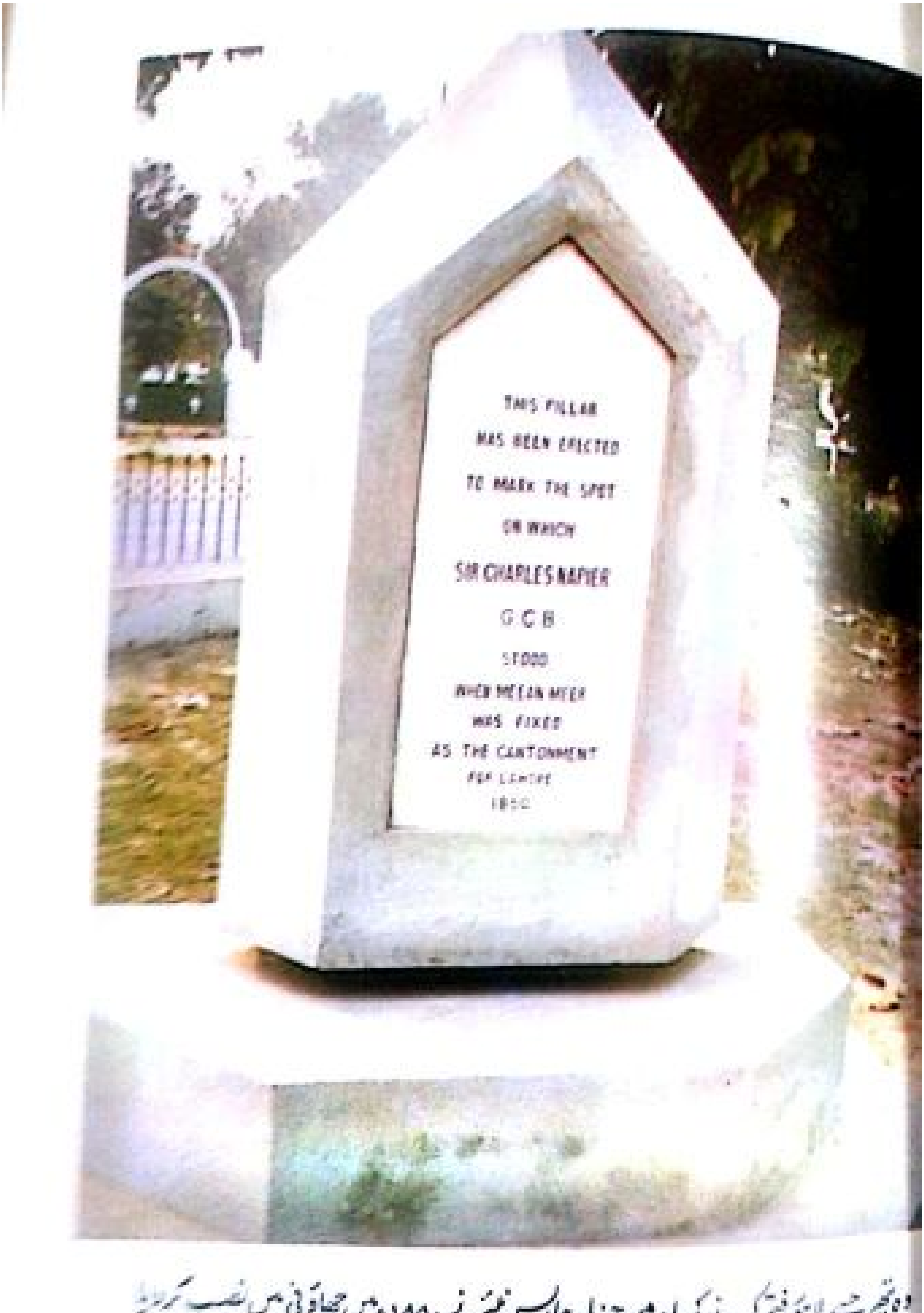
۱۸۳۹ء میں مہاراجا رنجیت سنگھ نے وفات پائی۔ لوگ اُسے عرف عام میں شیرِ پنجاب پکارتے تھے۔ اس کی وفات سے بڑا خلا پیدا ہوا۔ اس کے بعد کوئی اس طرح کا مظبوط سکھ لیڈر نہ مل سکا جو پنجاب کو کنٹرول کر سکتا۔

۱۸۳۲ء میں ولیم بینٹنک نے امیران سندھ سے بھی ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے انگریزوں کو سندھ میں تجارت کرنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن یہ بھی طے پایا کہ انگریز کبھی اپنی فوجیں سندھ میں سے نہیں گزاریں گے۔

۱۸۳۹ء میں افغانستان کی پہلی جنگ میں انگریزی افواج کو سندھ ہی میں سے گزارا گیا۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کے باوجود امیران سندھ اپنے معاہدہ پر قائم رہے۔

اس جنگ کے ختم ہونے پر لارڈ ایلن برا نے امیران سندھ پر الزام لگایا کہ وہ جنگ میں انگریزوں کے وفادار نہیں رہے۔ اور لارڈ موصوف نے سر چارلس نیپئر (Charles Napier) کو پورے اختیارات دے کر سندھ روانہ کیا کہ وہ اس واقعہ کی تحقیقات کرے۔ دراصل لارڈ ایلن برا اور چارلس نیپئر افغانستان میں اپنی شکست کا داغ دھونا چاہتے تھے۔

انگریزوں کے معاہدہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہونے کا بڑا سبب یہ تھا کہ افغانستان کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کے لئے سندھ ایک زبردست چھاؤنی کا کام دے سکتا تھا۔ اور دریائے سندھ تجارت کے لئے بہت مفید تھا۔ سر چارلس نیپئر نے بڑی چالبازی سے کام لیا۔ اُس نے وہاں پہنچ کر امیران سندھ کو سخت برہم اور برانگیختہ کیا۔ انہوں نے غصہ کے عالم میں انگریز ریذیڈنسی پر دھاوا بول دیا۔ نیپئر کی دلی تمنا یہی تھی۔ آخر جنگ چھڑ گئی۔ امیران سندھ کو میانی اور دابو



وہ پتھر جسے لاہور فتح کرنے کی یاد میں جنرل چارلس نیپئر نے ۱۸۵۰ء میں چھاؤنی میں نصب کروایا
تھا، اسے کیتھیڈرل ہائر سیکنڈری سکول کے متصل دیکھا جاسکتا ہے۔

Miani & Dabo کے مقام پر شکست فاش ہوئی اور سندھ ۱۸۴۳ء میں انگریزی عملداری کا ایک حصہ بن گیا۔

افغانستان میں شکست اور سندھ میں فتح پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک تاریخ دان اس طرح رقمطراز ہے۔

''ایک شخص نے باہر دشمن سے مار کھائی اور بعد میں گھر آکر بیوی کو مارنا شروع کر دیا تاکہ شکست کا کچھ ازالہ ہو جائے۔''[1]

۱۸۳۹ء میں مہاراجا رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد پنجاب میں ابتری پھیل گئی۔ سکھوں نے رنجیت سنگھ کے عہد کے چند سکھ جرنیل اور اس کے دو بیٹے قتل کر دیے۔ اس لئے اس کا سب سے چھوٹا بیٹا دلیپ سنگھ پانچ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس کی ماں رانی جنداں کو سرپرست مقرر کیا گیا۔ لال سنگھ اس کا وزیر تھا۔

انہی ایام میں شک گزرا کہ انگریز پنجاب پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنی فوج کو مضبوط کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ انگریز حملہ آور ہوتے سکھوں نے دریائے ستلج کو پار کر کے انگریزی علاقہ پر قبضہ کرنا چاہا۔

۱۸۴۵ء میں لارڈ ہارڈنگ اس وقت ہندوستان کا گورنر جنرل تھا۔ وہ جنگ آزما سپاہی تھا۔ اس نے ہیوگف کو ساتھ لے کر سکھوں کا بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا اور فتح حاصل کی۔ اسے سکھوں کی پہلی جنگ کہا جاتا ہے۔ اس جنگ میں مشہور سکھ سردار شام سنگھ اٹاری والا مارا گیا۔ سکھوں نے شکست تسلیم کر لی اور معاہدہ لاہور پر دستخط کر دیے جس کی رو سے یہ قرار پایا۔

---

1. Grant & Temperley, British Rule in India, conquest of Sind United Press, Delhi, page 347

۱۔ دوآبہ جالندھر سمیت انگریزوں کو دیا جائے۔
۲۔ سکھ فوج کم کر کے بیس ہزار سپاہی اور بارہ ہزار سوار ہوگی۔
۳۔ ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوانِ جنگ سکھوں کو ادا کرنا ہوگا۔
۴۔ اس جنگ کی وجہ سے خاص بات یہ ہوئی کہ سر ہنری لارنس کو لاہور ریذیڈنٹ مقرر کر دیا گیا اور ایک انگریز فوج قیامِ امن کے لئے لاہور میں رکھی گئی۔

سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد پنجاب میں انگریزوں کا عمل دخل شروع ہو گیا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانہ میں سکھوں کے ساتھ انگریزوں کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے۔ مگر بعد میں تعلقات تو ایک طرف سکھ آپس میں لڑنے کے علاوہ انگریزوں سے بھی اُلجھ پڑے۔

لارڈ ہارڈنگ کے بعد لارڈ ڈلہوزی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

لارڈ ڈلہوزی ۱۸۴۸ء۔۱۸۵۶ء

لارڈ ڈلہوزی کا شمار ہندوستان کے مشہور جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ اس عہدہ پر فائز ہونے کے وقت وہ زندگی کی چھتیس بہاریں دیکھ چکا تھا۔ اُس کا دور انگریزی سلطنت کی وسعت کے لئے مشہور ہے۔ اُس نے بہت سی اصلاحات کیں۔ کام کی زیادتی اُس کی صحت کی خرابی کا باعث بن گئی۔ اس لئے آٹھ برس کے بعد اُسے جنگِ آزادی سے ایک سال قبل واپس انگلستان جانا پڑا۔ اس کے وقت کا مشہور واقعہ پنجاب کا الحاق ہے جو سکھوں کی دوسری جنگ کے بعد عمل میں آیا۔

یہ جنگ ۱۸۴۸ء۔۱۸۴۹ء تک لڑی گئی۔ سبب یہ تھا کہ پہلی جنگ کے بعد انگریز افسروں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا گیا۔ یہ بات سکھوں کے لئے ندامت اور برہمی کا باعث تھی۔ ملتان میں دو انگریز افسروں اگینو اور اینڈرسن کو کسی سکھ

نے قتل کر دیا۔ یہ خبر پنجاب میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بغاوت کے آثار نظر آرہے تھے۔ سکھ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

دوسری مشہور جنگ کھاریاں سے ۲۵ میل دور ٹرنک روڈ پر جنوب کی سمت چلیاں والا CHILLIAN WALA کے مقام پر لڑی گئی۔ پہلے اس جنگ کا سپہ سالار لارڈ گف تھا مگر بعد میں چارلس نیپئر CHARLES NAPIER فاتح سندھ کو بھیجا گیا۔ اُس نے گجرات کے قریب ایک فیصلہ کن جنگ لڑی۔ توپوں کے استعمال کی وجہ سے اسے توپوں کی جنگ کہا گیا۔ اسی اثنا میں ملتان میں جنگ ہوئی۔ سکھوں کو شکست کے ساتھ ساتھ بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ ملتان پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔

مارچ ۱۸۴۹ء میں پنجاب انگریزی عملداری میں شامل کر لیا گیا۔ لارڈ ڈلہوزی کے وقت میں مسئلہ الحاق کی رو سے اگر کوئی ماتحت یا جاگیر دار بغیر اولاد وارث کے رحلت کر جاتا تو اُس کا علاقہ بھی انگریزی حکومت میں شامل کر لیا جاتا تھا۔ یہ نیا قانون نہ تھا بلکہ ایسا ہی قانون ولیم بینٹنک نے بھی نافذ کیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس کے اطلاق پر اب زور دیا جانے لگا تھا۔ اور یوں سات ریاستیں ستارہ، جھانسی، ناگ پور، جیت پور، سنبھل پور، بگھات اور اودے پور انگریزی حکومت میں شامل کر لی گئیں۔

لارڈ ڈلہوزی نہ صرف ایک فاتح تھا بلکہ اسے اصلاحات کا بادشاہ کہا جاتا تھا۔ یہ بات تاریخ کے ایک طالب علم کے لئے کافی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے کہ محکمہ تعمیر عامہ یعنی پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ یعنی نہریں، پل اور سڑکیں بنانے کا محکمہ اسی کے وقت میں شروع کیا گیا۔ کلکتہ سے پشاور تک جرنیلی سڑک GRAND TRUNK ROAD اسی کے زمانہ کی تعمیر اور یادگار ہے۔ سب سے بڑھ کر

ریلوے لائن کا پہلی مرتبہ اجراء ۱۸۵۳ء میں اسی دور میں ہوا۔ پہلی ریلوے لائن بمبئی سے تھانے تک تعمیر کی گئی جس کی لمبائی بیس میل تھی۔

لارڈ ڈلہوزی کے عہد کا تفصیل سے اس لئے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ تاریخ کلیسیا کا اس سے گہرا تعلق ہے۔ پنجاب کا فتح ہونا اس دور کی یادگار ہے۔ کیونکہ اس کے بعد ہی ۱۸۵۰ء میں دورِ جدید کا پہلا مشنری پنجاب میں آیا۔ سندھ، بلوچستان پنجاب اور پشاور کے بھی علاقے جو ۱۸۴۳ء۔ ۱۸۴۹ء میں انگریزی سلطنت میں شامل ہوئے آج کا پاکستان ہیں۔

اب ہمیں اس علاقہ کے حوالے سے آگے چل کر پاکستان کی کلیسیا کا حال دیکھنا ہوگا۔ وہی پاکستان جو ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو معرضِ وجود میں آیا۔ پاکستان کی موجودہ کلیسیا اسی دورِ جدید کی کلیسیا ہے۔ مسیحیت کے کام کو نئے سرے سے اُس وقت شروع کیا گیا جب انگریزی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ ابتداء میں جن لوگوں نے اس کام میں سرگرمی سے حصہ لیا اُن کی بابت جاننے کی اشد ضرورت ہے۔ لہٰذا پاکستان میں بشارت کے کام سے پہلے آیئے چند بشارتی شخصیات کی زندگی کو دیکھیں۔

جان نیوٹن ۔ دورِ جدید کا پہلا مشنری

مہاراجا رنجیت سنگھ ۱۸۳۹ء تک پنجاب کا حکمران رہا۔ اُس کی دلی آرزو تھی کہ انگریزی زبان کو پنجاب میں رائج کر کے سکھ بچوں کو مستقبل کے لئے تیار کرے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ۱۸۳۵ء میں لدھیانہ سے ایک امریکن مشنری جان لوری کو بلایا گیا اور لاہور میں سکول کھولنے کی اجازت مرحمت فرمائی گئی۔ لیکن شرط یہ تھی کہ یہ سکول خالصتاً سکھ بچوں کی تربیت گاہ ہوگا۔ جان لوری کو یہ شرط پسند نہ آئی کیونکہ وہ مشنری تھا اور مسیحیت کو پھیلانے کا متمنی تھا۔ اپنی اس اچھی سوچ کے پیش نظر اس نے یہ پیشکش ٹھکرا دی۔

رنجیت سنگھ کی موت کے بعد ۱۸۴۹ء میں جب پنجاب انگریزوں کے زیر نگیں تھا تو امریکن پریسبٹیرین مشن (جسے بعد میں لاہور چرچ کونسل کا نام دیا گیا) پنجاب میں وارد ہوئی۔ (آج امریکن پریسبٹیرین چرچ اور یونائیٹڈ پریسبٹیرین چرچ دونوں ایک دوسرے میں ۲۰ نومبر ۱۹۹۲ء کو مدغم ہو چکے ہیں)۔ اس مشن کا پہلا مشنری پادری جان نیوٹن لاہور آیا۔ اور وہ پنجاب کی فتح کے بعد ہی آیا اور اُس کے ساتھ چارلس ولیم فورمن بھی تھا۔ جان نیوٹن امریکن پریسبٹیرین سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس نے اور مشنری صاحبان کو دعوت دی۔ پنجاب کی سرزمین میں آنے سے پہلے وہ لدھیانہ میں (۱۸۳۵ء) بشارتی کام میں مشغول تھے۔ اور لاہور آنے کی راہ دیکھ رہے تھے تاکہ بشارت کے کام کو وسعت مل سکے۔ ان دونوں کا ساتھ ایسا ہی تھا جیسے پولس اور برنباس کا تھا۔ وہ شانہ بشانہ اس کار خیر میں منہمک رہے۔ اس رفاقت کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ کہ نیوٹن کی بیٹی چارلس فورمن کی اہلیہ تھی۔

پادری نیوٹن سب سے پہلے مہاراجا رنجیت سنگھ کے ایک وزیر کی حویلی میں رہنے لگے جو ایک تہ خانہ میں تھی۔ اگرچہ یہ جگہ ان کی رہائش کے قابل تو نہ تھی مگر انہوں نے وہاں رہنا پسند کر لیا۔

پادری موصوف نے پندرہ سال (۱۸۳۵ء۔۱۸۵۰ء) لدھیانہ اور لاہور میں خدمت کی۔ ۱۸۵۰ء میں موسم گرما کی حدت وشدت میں اضافہ کی وجہ سے وہ صاحب فراش ہوئے۔ مگر خرابی صحت ان کے مصمم ارادہ کے سامنے رکاوٹ نہ بن سکی۔ لاہور میں قیام کے دوران انہوں نے چھوٹے بچوں کی تربیت کے لئے ایک سکول کھولا جس میں روزانہ اڑھائی گھنٹے درس وتدریس کا کام کیا کرتے تھے۔ ۱۸۵۰ء میں مختصر قیام کے بعد وہ امریکہ واپس چلے گئے۔ مگر یہ جان نیوٹن ہی تھے جو اس سرزمین میں سب سے پہلے مشنری جذبہ لے کر آئے۔ ایف سی کالج میں ایک ہاسٹل انہی کے نام کی یادگار ہے۔ مگر صد حیف کہ آج وہ نام تبدیل کر دیا گیا ہے۔ دوسرے مشنریوں کے پیش رو بھی یہی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے راستہ تیار کیا اور دوسرے اسی پر چلتے رہے۔

پادری چارلس ولیم فورمن ڈی۔ڈی

چارلس فورمن ۳ مارچ ۱۸۲۱ء کو کنٹکی یو۔ایس۔اے میں پیدا ہوئے پرنسٹن تھیولاجیکل کالج سے علم الہیات کا مطالعہ کیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ میں کسی غیر ملک میں جا کر انجیل کا واعظ ہوں گا۔

اگرچہ پادری جان نیوٹن پہلے واعظ ضرور تھے جو سب سے پہلے پنجاب آئے مگر چارلس فورمن وہ تھے جنہوں نے بشارتی کام کی بنیادیں استوار کیں۔ چارلس اکثر پادری نیوٹن ہی سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

پادری چارلس فورمن جنوری ۱۸۴۸ء میں کلکتہ آئے اور چند ماہ بعد

لدھیانہ میں جو اُن دنوں سرحدی شہر تھا پادری نیوٹن کے ہاں ٹھہرے۔ لدھیانہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات کے درمیانہ ستلج حائل تھا۔

دونوں مشنری خلوص دل سے پنجاب کا دروازہ کھلنے کے منتظر تھے۔ تاکہ اپنے منجی کا فرحت افزاء پیغام پنجاب کے باشندوں کو سنا سکیں۔ اس سے قبل پادری لوری مہاراجا رنجیت سنگھ سے مل چکے تھے اور بضد تھے کہ مہاراجا کے بچوں کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ مسیحیت کا پرچار ضرور کریں گے جو مہاراجا کو ناپسند تھا۔ بہر حال لوری صاحب کو خلعت سے نوازا گیا۔ اور لوری صاحب واپس لدھیانہ چلے گئے۔ یہ پادری نیوٹن اور چارلس سے پہلے وہاں تھے۔ کیونکہ پادری فورمن ۱۸۵۰ء میں آئے اور قلعہ کے نزدیک قیام کیا۔

ان ہی دنوں پنجاب میں ہنری لارنس، جان لارنس، رابرٹ منٹگمری، ڈونلڈ میکلوڈ، ہربرٹ ایڈورڈ، اور جان نکلسن بھی آئے ہوئے تھے۔ اُن کے نام آج بھی پنجاب (لاہور) میں زندہ ہیں۔ اُن کے نام کی سڑکیں اور عمارات اُن کے قیام کا ثبوت فراہم کر رہی ہیں۔ یہ انتہائی دیندار اور ایماندار لوگ تھے جو صرف خداوند کے لئے جیتے تھے۔ اُنہوں نے نیوٹن اور فورمن کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ وہ تعلیم اور بائبل کی ضرورت کو جو پنجاب کے لوگوں کی ضرورت تھی پورا کرنے میں کوشاں تھے۔ سب نے فراخدلی سے اِس مقصد کو پورا کرنے کے لئے چندہ دیا۔ پانچ سال کے اندر اندر زمین خریدی گئی اور سکول اور گھر تعمیر کیے گئے۔ جنوری ۱۸۵۰ء میں سکول کی بنیاد رکھی گئی۔

سکول میں پادری نیوٹن اور فورمن کام کرنے لگے اور مسٹر گورو داس مترا جو ایک بنگالی مسیحی تھے پہلے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔

۱۸۵۲ء میں رنگ محل (شاہ عالم مارکیٹ) خرید کر سکول وہاں منتقل کیا

گیا۔ ۱۸۵۲ء میں اس سکول میں طلبا کی تعداد سات سو پچاس تھی۔

فورمن خوب جانتے تھے کہ سکول انجیلی بشارت کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ وہ سکول سے فارغ ہو کر پرانے لاہور کی گلیوں میں انجیل کا پیغام دینے پہنچ جاتے تھے۔ تعلیمی کام میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ انگریز کمشنر صاحبان نے انہیں گوجرانوالہ اور راولپنڈی میں تعلیمی کام کی ذمہ داری سونپ دی۔ اس طرح فورمن تعلیم کے محکمہ کا پہلا ڈائریکٹر تھا۔

فورمن نے لاہور میں ۳۵ سال کام کیا لیکن اس کی زندگی کا منشا و مقصد اشاعتِ انجیل تھا۔ اس کا روزانہ کا معمول لاہوری دروازہ، دہلی دروازہ، بھاٹی دروازہ اور رنگ محل میں لوگوں کو پیغام نجات دینا تھا۔ وہ منادی کے کام کو انجام دینے کے لئے ٹریکٹ، پمفلٹ اور کتابیں تقسیم کیا کرتے، دکانوں اور بازاروں میں دینی مسائل پر بحث کیا کرتے تھے۔ فارغ التحصیل طلباء بھی بازاری منادی میں اس کی باتوں کو غور سے سنتے اور بسا اوقات مددگار بھی ثابت ہوتے تھے۔ اس کے الفاظ روح کی تاثیر رکھتے اور اس کے دل کی ترجمانی کرتے تھے۔ وہ کبھی انجیل سے نہ شرمایا بلکہ اکثر منادی کرتے کرتے لاہور سے دور راولپنڈی تک نکل جاتا تھا۔ اسی نے بشارتی کام کو قصور، شرقپور اور شاہدرہ تک بڑھایا۔

جولائی ۱۸۵۵ء میں فورمن نے جان نیوٹن کی سب سے بڑی بیٹی مارگریٹ سے شادی کر لی۔ اس وقت اس کی عمر ۳۵ سال تھی اور مارگریٹ نے عمر کی بیسویں سیڑھی پر قدم رکھا تھا۔

۱۸۶۴ء میں رنگ محل سکول ترقی کر کے کالج تک جا پہنچا۔ فورمن اس کے بانی تھے۔ انیس سال متواتر پنجاب میں خدمت کرنے کے بعد پہلی بار امریکہ گئے۔ ان کے سات بچے ان کے ہمراہ تھے۔ واپسی پر چار بچے امریکہ ہی میں رہ گئے۔

اُن کی بیوی مارگریٹ کی عمر ابھی چونتیس برس کی ہوئی تھی۔ وہ ۱۸۷۰ء میں داغِ مفارقت دے گئی۔

فورمن تہتر برس کی عمر میں کسولی گئے اور بیمار پڑ گئے اور یہ جلیل جلیل خداوند میں سو گئے۔ جب اُن کا جنازہ لاہور لایا گیا تو ریلوے اسٹیشن پر ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر اقوام کا وہ جمِ غفیر تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔

اُن کا جنازہ مشن احاطہ سے قبرستان پہنچایا گیا۔ پچالیس سال کی خدمت نے اہلِ لاہور کے دلوں میں اسقدر جگہ بنالی تھی کہ وقتِ تجہیز و تکفین کونسی آنکھ تھی جو اشکبار نہ ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ بہت سے امیر فورمن کی منادی سے مسیحی نہ ہوئے۔ لیکن بہت سے غربا نے مسیح خداوند کو اپنا نجات دہندہ قبول کرلیا۔ اُس کے دورِ منادی میں لاہور میں ایک سو مسیحی موجود تھے۔ یہ وہ اعلیٰ مقتدر ہستی تھی جس نے لاہور کو سدھارا، مسیحی بشارت کا جو رد اُس نے رکھا اُسی پر بعد میں ایک عمارت بنتی گئی۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر

لوگ ساتھ ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

چارلس فورمن چھ فٹ قد آور شخصیت کا مالک تھا۔ لمبی داڑھی، نیلی آنکھیں، اور کشادہ اور خندہ پیشانی اُس کی قابلیت کی مظہر تھی۔ اُس کی یاد میں فورمن کرسچن کالج تعمیر ہوا۔ لاہوری دروازہ کے پاس جہاں وہ انجیل کی منادی کیا کرتا تھا، فورمن چیپل بنایا گیا۔

پادری اینڈریو گورڈن (ڈی۔ڈی)

REV. ANDREW GORDON D.D.

UNITED PRESBYTERIAN CHURCH

پادری اینڈ گورڈن ۱۸۲۸ء میں یو۔ایس۔اے میں پیدا ہوئے اور جوانی میں خدمت کا پیشہ اختیار کیا۔

جوانی کے دنوں میں جو خدا کو یاد کرتے ہیں
مبارک وہ جواں ہیں جو مسیح کو شاد کرتے ہیں

۱۸۵۲ء میں اُن کی شادی ایک دیندار اور خدا پرست خاتون ربقہ کیمبل سے ہو گئی۔ پریسبیٹرین سنڈ آف نارتھ امریکہ کے اجلاس میں یہ قرار پایا کہ ہندوستان میں انجیل کی اشاعت کے لئے ایک مشن کھولا جائے۔ اینڈریو گورڈن کو پہلے مشنری کے طور پر تقرر ہوا۔ آپ اپنی اہلیہ او ر بہن الزبتھ کے ہمراہ ۲۸ر ستمبر ۱۸۵۴ء کو نیو یارک سے بحری جہاز میں سوار ہو کر ۱۳ر فروری ۱۸۵۵ء کو کلکتہ پہنچے۔ ۸ر اگست کو لاہور آ کر سیالکوٹ روانہ ہو گئے۔

اسی سال پادری افرائیم اور پادری اے۔آر ل بھی سیالکوٹ آ گئے۔ ۱۸۵۵ء میں سیالکوٹ مشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔

پادری گورڈن کو خوش قسمتی سے بلکہ خداوند کی مہربانی سے دو ہندوستانی نوجوان بھائی الیشع سوفٹ (ELISHA SWIFT) اور جارج سکاٹ (GEORGE SCOTT) مل گئے اور خدمت کا کام شروع کیا گیا۔ انہی دنوں میں عبداللہ آتھم بھی اس خدمت میں شامل ہو گئے۔

پادری گورڈن، سوفٹ اور سکاٹ نے مل کر ظفر وال کی اطراف میں
خدمت شروع کی۔
۲۵ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کو جنگ آزادی کے بعد ایک ہندو رام بھجن مسیحی ہو
گیا۔ یہ گورڈن کی منادی کا صلہ تھا۔ ۱۸۵۸ء میں نو مزید ہندوؤں اور مسلمانوں
نے بپتسمہ لیا۔
۱۸۵۸ء میں کلیسیاء کا نام یونائیٹڈ پریسبیٹرین چرچ آف نارتھ امریکہ
میں تبدیل کر دیا گیا۔
۱۸۵۹ء میں سوفٹ اور سکاٹ بطور خادم الدین خدمت انجام دینے
لگے۔
جنوری ۱۸۶۳ء میں گوجرانوالہ میں بھی مشن نے کام شروع کر دیا۔
سیالکوٹ میں لڑکے اور لڑکیوں کے لیے یتیم خانے قائم کیے گئے۔ مزید برآں لڑکوں
کے لیے ایک سکول کھولا گیا۔ مس الزبتھ گورڈن اس یتیم خانہ کی انچارج تھیں۔
ظفر وال میں نواں پنڈ، سکاٹ گڑھ، جندراں اور تحصل میں میگھوں کے
درمیان منادی کی جانے لگی۔
۱۸۶۶ء کے موسم گرما میں ایک شخص پپو اور اس کے دوسرے ساتھیوں
نے سکاٹ کی منادی پر مسیحیت کو قبول کرنا چاہا۔ مسیحیت قبول کرنے والے ان
اشخاص کو زدوکوب کیا گیا۔ تمام ساتھیوں نے پپو کو چھوڑ دیا۔ مگر اس کا ایمان متزلزل
نہ ہوا۔ اس زدوکوب کی وجہ سے وہ سخت بیمار ہو گیا۔ اور اس دنیا سے کوچ کرنے
سے پیشتر اس نے اپنے بھائی بھجنا کو بلا کر وصیت کی کہ صرف مسیحیت ہی ایک سچا دین
ہے۔ اس پر قائم ہو جاؤ۔
پپو تو اس جہاں میں نہ رہا مگر بھجن اور اس کا دوست نمبردار رام کا بیٹا

کنہیا سکاٹ کی کوششوں سے ۱۸۶۶ء میں مسیحی ہو گئے۔ تو اس پنڈ کے سکھوں نے ان دونوں پر بڑا ظلم ڈھایا۔ بیوی بچے چھین لیے۔ لیکن یہ دونوں اپنے ایمان پر قائم رہے۔ اُن کی استقامت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۷۱ء میں پچھ اور سکھ مسیحی ہو گئے۔

گورڈن اور اُس کے ہمنوا، سکاٹ اور سوفٹ کی منادی رنگ لائی۔

ظفروال، پسرور، نارووال اور سیالکوٹ میں بڑا کام ہوا۔ یہ یو پی چرچ ہی ہے جس نے بشارت اور تعلیم کے میدان میں پاکستان بھر میں سب سے زیادہ خدمت کی ہے۔ سیالکوٹ میں یو۔ پی چرچ قائم ہوا جسے کلیساؤں کی ماں گردانا جاتا ہے۔ یہی کلیسیا ہے جس نے سب سے زیادہ دیسی لیڈرشپ پیدا کی۔ بڑے بڑے ماہرین تعلیم، پاسبان اور ڈاکٹرز اسی جگہ سے میسر آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر اے پی اور یو پی چرچ خدمت کے کام میں پہل نہ کرتے تو بشارت کا کام آج بہت پیچھے رہ گیا ہوتا۔

ہماری صرف اور صرف یہی دُعا ہے کہ خداوند پریسبیٹرین چرچ آف پاکستان کے اقبال کو بلند رکھے۔

گورڈن ۱۸۸۷ء میں خرابیٔ صحت کی وجہ سے امریکہ چلے گئے۔ اور اسی ایمان کی حالت میں خداوند میں سو گئے۔

گو وہ مر گیا تاہم آج بھی زندہ ہے

خداوند نے فرمایا جو مجھ پر ایمان لاتا ہے گو وہ مر جائے تو بھی زندہ رہے گا۔

اس کلیسیا نے ۱۸۳۹ء میں راولپنڈی میں کالج قائم کیا تو اُسے ایڈریو گورڈن کالج کا نام دیا تاکہ اُس کے ایمان اور خدمت کی یاد ہمیشہ تازہ رہے۔

کاش اینڈریو گورڈن کی زندگی تھوڑی سی اور وفا کرتی اور بشارت کا سلسلہ اسی طرح قائم رہتا۔ اور لوگ حلقہ بگوش مسیحیت ہو کر خداوند کی کلیسیا کو اور وسعت دیتے۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

پادری رابرٹ کلارک

REV. ROBERT CLARK

ANGLICAN CHURCH

پادری رابرٹ کلارک ۱۸۲۵ء میں انگلستان میں پیدا ہوئے۔ وہ پنجاب میں انگلیکن چرچ کے پہلے مشنری تھے۔ آپ نے ۱۸۵۰ء میں ٹرنٹی کالج کیمبرج سے بی۔ اے کیا اور مشنری بن کر ہندوستان میں خدمت کرنے کا عہد کیا۔

۱۸۵۲ء میں راس اُمید کے راستہ کلکتہ پہنچے۔ پھر اسی سال امرتسر آ گئے۔ اُس وقت پادری نیوٹن اور فورمن پادری گولک ناتھ کے ساتھ پنجاب پہنچ کر مشنری کام شروع کر چکے تھے۔

امرتسر پہنچنے پر پادری فٹز پیٹرک اور اس کی رفیقہ حیات نے اُس کا خیر مقدم کیا۔ ہنری لارنس اور جان لارنس نے بھی جو پنجاب میں سرکار انگریزی کے حاکم اعلیٰ تھے کلارک صاحب کو بڑے تپاک طریقہ سے خوش آمدید کہا۔

۱۸۴۹ء میں پنجاب انگریزی حکومت میں شامل ہو گیا اور پشاور پر بھی انگریزوں کا قبضہ تھا۔ چند ایک انگریز افسر بہت خدا پرست تھے۔ اُنہوں نے چرچ مشنری سوسائٹی پشاور میں مشنری طلب کیے مگر کرنل میکی سن نے جو سرحد کا چیف کمشنر تھا کہا کہ کوئی مشنری سندھ دریا کے پار سے بشارتی کام کے لئے نہیں آئے گا کیونکہ

اس طرح انگریزی سرکار کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

لیکن پاک کلام میں درج ہے جو کوئی اپنی جان بچائے گا۔ وہ اُسے کھو
گا۔ اور جو کوئی میری اور انجیل کی خاطر اپنی جان گنوائے گا وہ اُسے پائے گا۔
مرقس ۸: ۳۵

کرنل میکی سن چیف کمشنر سرحد اپنے کمرہ میں بیٹھا تھا کہ ایک پٹھان آیا
باریابی کی درخواست کی۔ اور اُسے قتل کر کے بھاگ گیا۔

اُس کے قتل کے بعد سر ہربرٹ ایڈورڈز SIR HERBERT
EDWARDS سرحد کا چیف مقرر ہوا۔ وہ نہایت خدا پرست تھا، دیندار اور
مسیحی تھا۔ انگریز افسران نے جب اُس سے مشنریوں کے متعلق درخواست کی تو اُس
نے کہا۔

خدا اس جہاں کا مالک ہے۔ فتح اور شکست اُس کے ہاتھوں میں ہے۔ کیا
خدا کی صرف یہ مرضی ہے کہ ہم صرف ورنیکلر تعلیم دیں، ٹیکس وصول کریں، نہ
نہریں بنائیں، تجارت کریں، ریل اور تار گھر ہندوستان میں قائم کریں یا دیگر
بادشاہوں کی طرح مندر ڈھائیں یا رنجیت سنگھ کی طرح مسجدوں میں خون بہائیں۔
پس مسیحیوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستان میں بشارت کا پیغام دیں۔ میں برملا کہتا
ہوں کہ اس جگہ مشن کے قیام سے نقصِ اَمن کا اندیشہ نہ ہوگا۔

۱۸۵۴ء میں امرتسر کے مشنریوں نے کلارک اور فینڈر کو یہاں سے
تبدیل کر کے پشاور بھیج دیا۔ رابرٹ کلارک ۱۸۵۵ء میں پشاور چلے گئے۔ پشاور
آنے والا وہ چرچ مشنری سوسائٹی کا پہلا مشنری تھا۔ اُن کے ہمراہ فینڈر بھی تھا۔
کلارک نے ۱۴ رمئی ۱۸۵۵ء میں پشاور میں ایک ہائی سکول قائم کیا اور
دونوں نے بازاری منادی جاری رکھی۔

۱۸۵۷ء کے فسادات میں خداوند نے ان کی عجیب طریقہ سے حفاظت کی اور دونوں محفوظ رہے۔

کلارک سکھوں کی پلٹن میں بھی بشارت کا کام کرتا اور خدا کا کلام سناتا تھا۔ کئی دفعہ بڑی مخالفت ہوئی۔ لیکن بیشتر موقعوں پر وہ بچتے رہے۔ کلارک کی خدمت کے ایام میں کافرستان کشمیر تک بشارت دی گئی اور کلام سنایا گیا۔

حسن شاہ پہلا کشمیری تھا جو مسیحیت کی طرف راغب ہوا۔ یہ بات سچائی پر مبنی ہے کہ اگر کلارک جیسے بیدار مغز اور جفاکش مشنری مختلف مشنوں میں آتے رہتے تو آج پاکستانی اور ہندوستانی کلیسیاؤں کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا۔

ان کی کوشش سے کئی لوگوں نے مسیح خداوند کو قبول کیا۔ امرتسر میں پہلا شخص جو مسیحیت میں شامل ہوا اُس کا نام کبیر سنگھ تھا۔ اُس نے ۱۸۵۳ء میں بپتسمہ لیا۔ ۱۸۵۴ء میں مسیح خداوند کو قبول کرنے والا پہلا پنجابی سکھ داؤد سنگھ تھا۔ ۱۸۶۵ء میں عمادالدین لاہز جو زبردست مناظر تھا مسیحی ہوا۔

اس سال کلارک کو امرتسر واپس تبدیل کر دیا گیا۔ کلارک چاہتا تھا کہ نومرید مسیحیوں کو ایک جگہ رکھا جائے۔ اس ضمن میں ایک قطعہ اراضی گورنمنٹ سے حاصل کیا گیا۔ اور مسیحیوں کے پہلے گاؤں کلارک آباد کی بنیاد ۱۸۶۷ء میں رکھی گئی۔ آج یہ گاؤں رابرٹ کلارک کے نام سے موسوم ہے اور جانا جاتا ہے۔ یہ قدیم ترین مسیحی گاؤں ہے۔

۱۸۶۹ء میں ضرورت پڑی کہ لاہور میں علم الٰہیات کا سکول قائم کیا جائے چنانچہ مہان سنگھ باغ کی زمین سستے داموں خریدی گئی اور ۱۸۱۷ء میں لاہور ڈیوئنی سکول (LAHORE DIVINITY SCHOOL) کی ابتدا ہوئی۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مسیحی کتب کی طباعت اور فروخت کے لئے

پنجاب میں کوئی ادارہ نہ تھا۔ کلارک صاحب نے امریکن مشن والوں کے ساتھ مل کر پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور اُس کا پہلا سیکرٹری مقرر ہوا۔

۱۸۷۴ء میں کلارک نے پادری عماد الدین لاہز کے ساتھ مل کر انجیل متی، یوحنا اور اعمال کی کتاب کی تفسیر لکھی

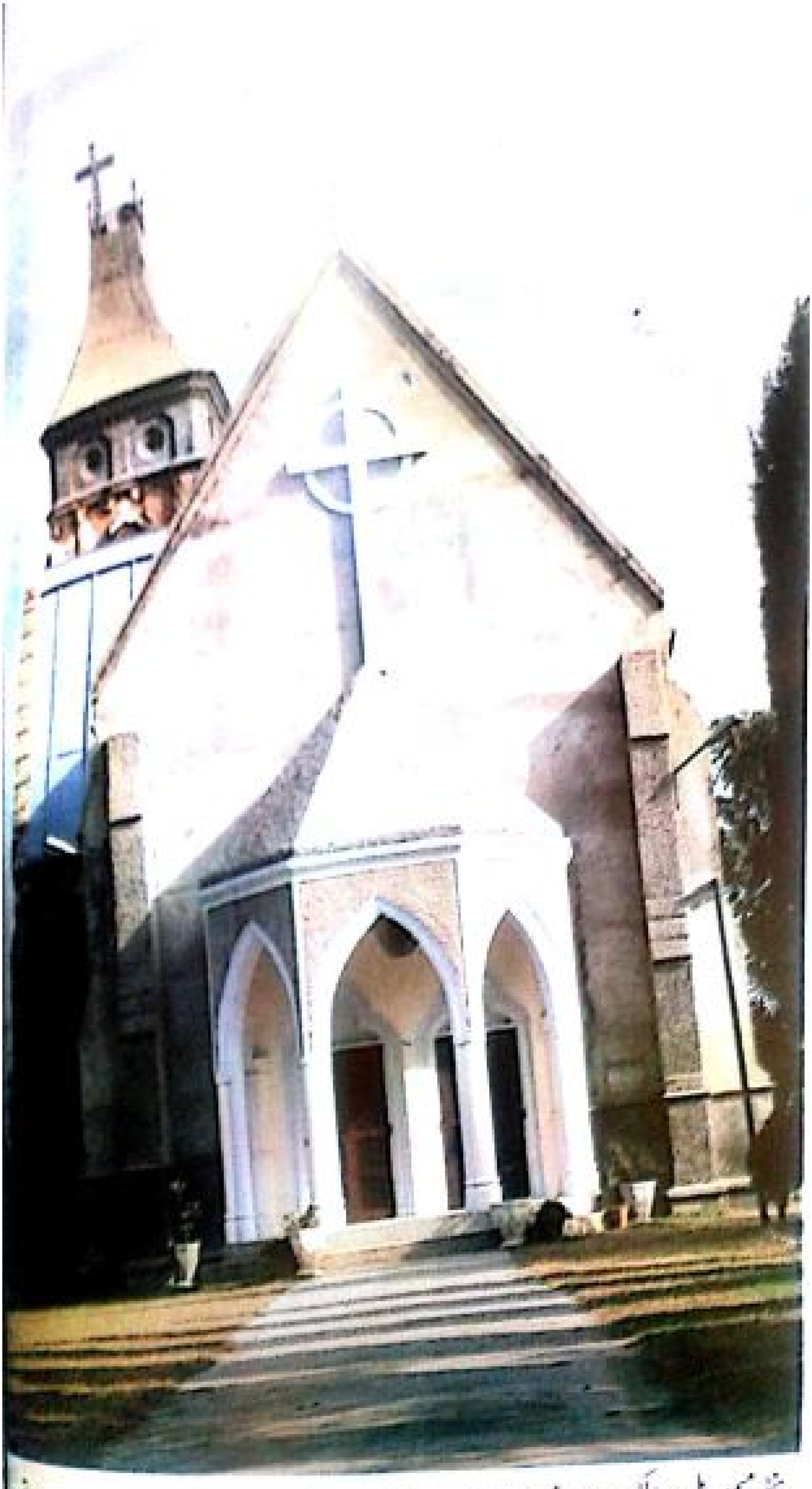
رابرٹ کلارک خود چرچ آف انگلینڈ سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ پنجاب کے مسیحی مغربی مشنریوں کے جھگڑوں اور زنجیروں میں جکڑے رہیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اس نے پریسبیٹرین اور چرچ آف انگلینڈ والوں کو دعوت دی۔ اور پنجاب میں دیسی چرچ کونسل کی بنیاد رکھی۔ کلارک واقعی ایک زبردست مشیر، لیڈر اور مسیحی خادم تھا۔

وہ لکھتا ہے۔

"مسیحیت کسی قوم کو غلام نہیں بناتی بلکہ اُس کو مضبوط بنا کر سرفراز کرتی ہے"۔

یکم مئی ۱۹۰۰ء کے موسم گرما میں وہ کسولی گیا۔ وہاں سخت بیمار ہو گیا۔ اُس کا آخری وقت آ پہنچا تھا۔ مسز کلارک قریب بیٹھی زبور نمبر ۲۳ پڑھ رہی تھی۔ ۶ مئی ۱۹۰۰ء کو مسیح خداوند کا عظیم خادم تقریباً پچھتر سال (۷۵) کی عمر میں ابدی آرام میں داخل ہو گیا۔ اُسے امرتسر لا کر ہزاروں مسیحی اور غیر مسیحی سوگواروں کی موجودگی میں پُرنم اور اشکبار آنکھوں سے سپرد خاک کر دیا گیا۔

امرتسر، لاہور، کشمیر، کافرستان اور پشاور میں خدمت کی بنا پر رابرٹ کلارک کا نام چرچ آف انگلینڈ کے پہلے مشنری کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔



ہنٹر میموریل سیالکوٹ جو مس ہنٹر اور اس کے خاندان کی شہادت کے سلسلہ میں ۱۸۹۱ء میں تعمیر
کیا گیا

آپ کو مسیح کی خدمت کے لئے دے دیا۔

عین جوانی کے عالم میں اپنے

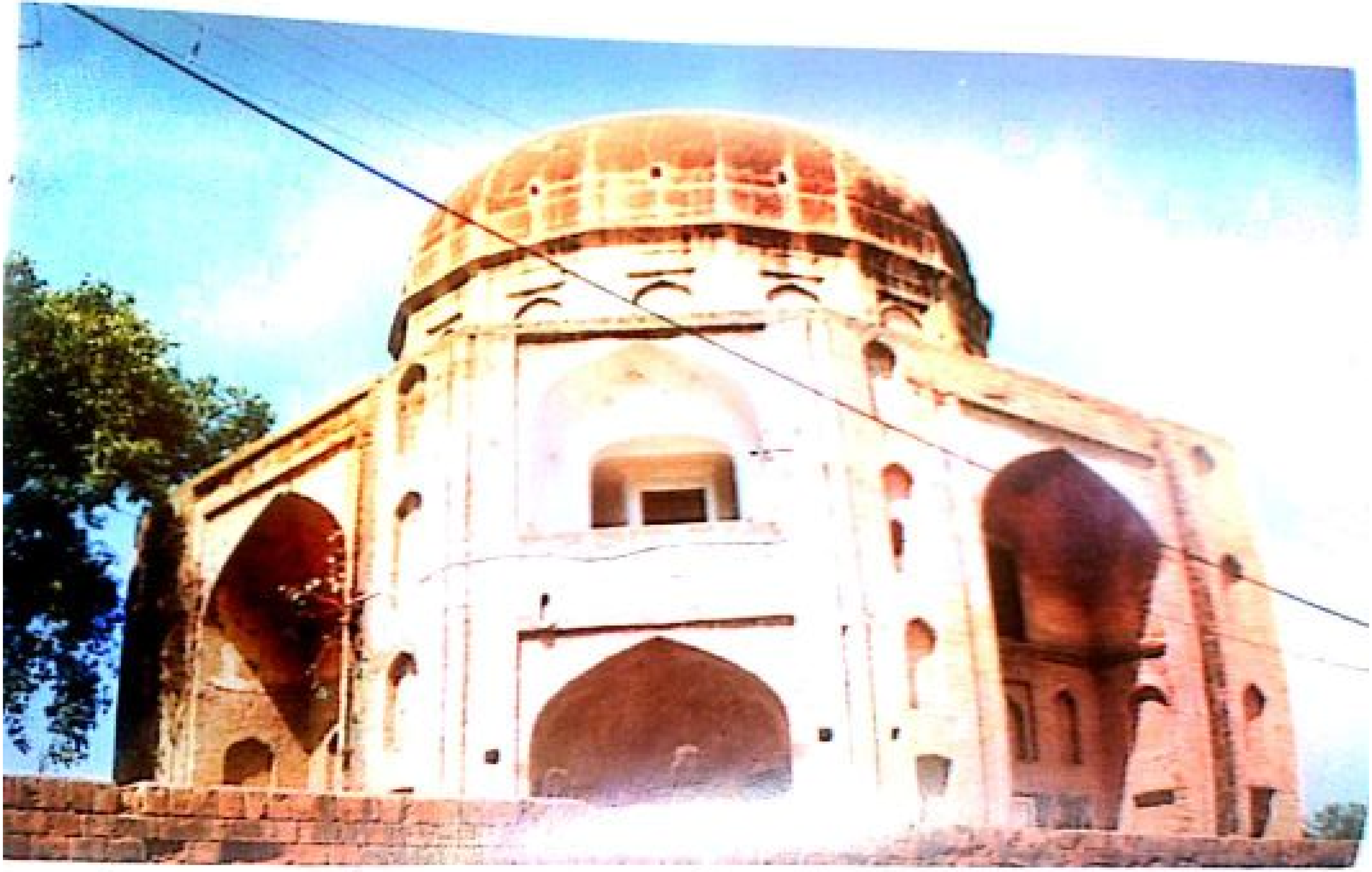
ٹامس ہنٹر اور اُنکی بیوی راس اُمید سے ہوتے ہوئے بمبئی پہنچے۔ تھوڑا عرصہ یہاں قیام کیا۔ بمبئی میں اُن کی خدمت کے زیرِ اثر سات اشخاص نے مسیح خداوند کو قبول کیا۔ اُن میں سید محمد اسماعیل تھے جو بعد ازاں ہنٹر صاحب کے ساتھ سیالکوٹ تشریف لے گئے۔

۱۸۵۶ء میں ۱۲۷۴ میل کی مسافت طے کر کے تینوں کراچی پہنچے۔ پھر دریائے سندھ میں سے سفر کرتے ہوئے دریائے جہلم کے راستہ جہلم شہر پہنچے اور گجرات سے ہوتے ہوئے سیالکوٹ آ گئے۔ آپ نے یہاں آ کر پہلے چھاؤنی میں رہائش اختیار کی۔

۲۸ رفروری ۱۸۵۷ء کے روز ایک خط سکاٹ لینڈ لکھا کہ میں پنجابی سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک سکول لڑکوں کے لئے اور دوسرا لڑکیوں کے لیے کھولا ہے۔ ہفتہ وار عبادت ہوتی ہے اور نومریدوں کو باقاعدہ مسیحی تعلیم دی جاتی ہے۔

انہی ایام میں جنگِ آزادی شروع ہو گئی۔ سر جان لارنس نے تمام بدیشی لوگوں کو لکھا کہ وہ لاہور قلعہ میں آ جائیں ورنہ اُن کی جان و مال کی حفاظت ہماری ذمہ داری نہ ہوگی۔ سیالکوٹ کے افسر یقین نہ کرتے تھے کہ سیالکوٹ بھی فسادات کی زد میں آ سکتا ہے۔ لیکن حالات سارے ملک میں قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ ہنٹر صاحب نے بھی کوشش کی کہ وہ لاہور قلعہ پہنچ جائیں۔ اب وہ ایک بچے کے باپ بھی بن چکے تھے۔ ۸ رجولائی کو وہ لاہور جانے لگے۔ لیکن اُس روز وہ نہ جا سکے۔ اُسی رات جین ہنٹر نے خواب دیکھا کہ وہ تینوں قتل کر دیئے گئے ہیں۔

۹ رجولائی ۱۸۵۷ء کو علی الصباح تیار ہو کر وزیر آباد پہنچے۔ سامنے سے بلوائی آ رہے تھے۔ گاڑی اور گھوڑے کا رُخ موڑا اور سیالکوٹ قلعہ کی طرف چلنے کا



مشن ہسپتال پشاور کی گنبد نما عمارت جسے انگریزوں نے پنجاب اور سرحد کو فتح کرنے کے بعد بطور ریذیڈ کوارٹر استعمال کیا اور آجکل اسے چیپل کی حیثیت حاصل ہے

ارادہ کیا۔ جب ہال بھیڑ کے پل کے قریب پہنچے جو سی ٹی آئی سکول سے پون میل دور ہوگا۔ تو حرمت خان ڈاکو جو جیل توڑ کر باہر نکل آیا تھا سامنے آگیا اور اس نے پکارا کہ وہ دیکھو انگریز آ رہا ہے۔ لوگوں نے منع کیا کہ وہ انگریز پادری ہے۔ ہمارا جھگڑا انگریزی سرکار کے ساتھ ہے۔ اس نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا ہے۔ اس نے جب دیکھا کہ کوئی اُس کا ساتھ نہیں دے رہا تو خود ہی آگے بڑھ کر پہلے ہنٹر صاحب کو پھر اُس کی اہلیہ کو اور آخر میں بچہ کو قتل کر کے سڑک پر خون میں غلطان چھوڑ کر چلا گیا۔

ایک بزرگ نے کہا ہے کہ ہنٹر صاحب کے کہنے پر پہلے اُس کی بیوی کو پھر بچہ کو اور بعد میں خود اُسے شہید کیا گیا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی بیوی اور بچے کی بے حرمتی کی جائے۔

تینوں خداوند مسیح کے لئے مر گئے۔ مگر جہاں وہ شہید ہوئے آج وہاں پاکستان کی سب سے بڑی اور پرانی کلیسیا موجود ہے۔ اور سیالکوٹ کے مسیحی قریب قریب ساری دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔

شہیدوں کا خون رائیگاں نہیں جاتا۔

جیروم نے کیا خوب فرمایا۔

BLOOD OF MARTYRS IS THE SEED OF THE CHURCH

شہیدوں کا خون کلیسیا کی بنیاد ہے۔

۹ رجولائی دوپہر کے وقت ہنٹر، جین ہنٹر اور اُن کے فرزند کو شہید کیا گیا۔ اُن کی یاد میں ۱۸۶۱ء میں ہنٹر میموریل چرچ، ہنٹر پورہ سیالکوٹ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ ۱۸۶۵ء میں اس چرچ کی تقدیس ہوئی۔

REV. JOHN اس کام کی تکمیل کرنے والا پادری جان ٹیلر

TAYLOR تھا۔

وہ خود چرچ آف سکاٹ لینڈ کا مشنری بن کر ۱۸۶۰ء میں ہنٹر کی جگہ

سیالکوٹ آیا تھا۔

ہنٹر میموریل چرچ کے اندر یادگار تختی جو ہنٹر کی یاد میں نصب کی گئی ہے

اس کے الفاظ یوں ہیں۔

HUNTER MEMORIAL CHURCH SIALKOT

THIS CHURCH WAS ERECTED IN MEMORY OF REV.THOMAS HUNTER M.A.

FIRST MISSIONARY OF CHURCH OF SCOTLAND IN THE PUNJAB.

JANE HUNTER, HIS WIFE, WHO WITH THEIR INFANT SON WERE MARTYRED IN SIALKOT ON 9TH JULY, 1857

زبور ۱۱۶:۱۵۔ "خداوند کی نگاہ میں اس کے مقدسوں کی موت گراں قدر ہے۔"

چرچ آف سکاٹ لینڈ کے مشنری اور کارندے آتے رہے۔ تعلیم اور بشارت میں اس کلیسیاء نے بہت خدمت سرانجام دی۔

اس کلیسیا کا کام سیالکوٹ، گجرات، ڈسکہ، وزیر آباد اور جلال پور جٹاں میں آج بھی جاری ہے۔ اب یہی چرچ آف سکاٹ لینڈ (سیالکوٹ چرچ کونسل) ۱۹۷۰ء میں چرچ آف پاکستان میں مدغم ہو گیا ہے۔ اس کے سکول، مرے کالج اور بشارتی میڈیکل پروگرام وہ کام ہیں جس کی بنیاد مس ہنٹر، جین ہنٹر، اور ننھے ہنٹر کے خون

پر لکھی گئی تھی ۔

ہنٹر کلیسیائے پاکستان کا پہلا شہید ہے ۔

"جان دینے تک بھی وفادار رہ تو میں تجھے زندگی کا تاج دوں گا" ۔

حاشیہ ۱۰۲

اس باب ششم میں جن پانچ ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہیں جنہوں نے موجودہ پاکستان یعنی چار صوبے فتح ہونے کے بعد بشارت کا جھنڈا پکڑا اور سینہ سپر ہو کر پنجاب اور سرحد کی سرزمین کو نکل گئے ۔

سندھ اور بلوچستان اُس وقت اتنے دور افتادہ نہ ہوں گے ۔ لیکن دو ایک باتوں کے پیش نظر ۱۸۵۰ء کی دہائی میں اس طرف اتنی التفات نہ ہوئی ۔ اولاً یہ کہ یہاں پر آبادی بہت کم تھی ۔ ایک گاؤں یا شہر دوسرے گاؤں یا شہر سے دور تھا ۔ دوم سرزمین پنجاب انجیل کی بشارت کے لیے زیادہ موزوں تھی ۔ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۶۰ء کے درمیان جن لوگوں نے انجیل سنانے کا فریضہ قبول کیا اور ایک طویل عرصہ تک کام کیا یا ہنٹر کی طرح اپنی جان دے دی اُن پانچ کا ذکر کرنا مناسب تھا ۔ یہ لوگ تھے جنہوں نے لاہور، قصور، گوجرانوالہ، شرقپور، شاہدرہ، سیالکوٹ، نارووال، ظفروال، پسرور، گجرات، راولپنڈی، پشاور اور کشمیر تک خداوند کا زندہ کلام پہنچایا اور اُس کے نام کی خوشخبری دی ۔ دور دراز کی مسافت طے کر کے ۔ یو۔ ایس۔ اے، انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ سے چلے کر موت آئے اور اُسے گلے لگائیں ۔

آج پاکستان کی کلیسیا خداوند مسیح کے فضل سے اُنہی کی کوشش کی مرہون منت ہے یہ قافلہ کے سپہ سالار تھے ۔ ہراول دستہ کی قیادت انہی کے ہاتھوں میں رہی گئی ۔ وہ آگے آگے چلتے گئے ۔ اور لوگ ساتھ ملتے گئے ۔ پھر کلیسیا ، اور پھر

کارواں بنتا گیا۔ یہاں تک کہ آج وہی کلیسیا لاکھوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔
خداوند کرے اِس کلیسیا، کا اقبال دِن بدن بڑھتا چلا جائے۔

اَب آگے چل کر اُن بشارتی تحاریک کا جائزہ لیں گے جو انہی پانچ حضرات کی بدولت عمل میں آئیں یا اُن کے ہمنوا ساتھیوں نے اِس کام کو جو بشارت کا تھا آگے بڑھایا۔

ساتویں باب میں بشارتی تحاریک، لوگوں، علاقوں اور تنظیموں کا ذکر ہوگا جنہوں نے وہاں کام کیا۔

بشارت میں پیش قدمی اور مختلف تحاریک

ابتدائی ایام میں کلیسیا کی سماجی مذہبی اور سیاسی حالت

حقیقت یہ ہے کہ فطرت ہمیشہ مناسب وقت کے انتظار میں رہتی ہے۔ کلام مقدس میں لکھا ہے کہ جب وقت پورا ہوا تو خدا نے اپنے بیٹے کو دنیا میں بھیجا۔ بعینہٖ کلیسیا جب مغلیہ خاندان کے زوال کے وقت تتر بتر ہوگئی اور جو بقیہ رہ گیا تھا وہ پانچ چھ مسیحیوں پر مشتمل تھا جو لاہور میں کلیسیا کے طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔

مقدس جیروم فرماتے ہیں۔ ''کہ ہمارا بقیہ ہماری کسی نیکی کے سبب نہیں بلکہ محض خدا کے فضل و کرم سے ہے''

اگر پاکستان کے اس موجودہ خطہ میں انگریزی حکومت قائم نہ ہوتی، انگریز اور امریکن بشارتی کام سرانجام نہ پاتا تو بہت ممکن ہے آج کے پاکستان میں کلیسیا کی حالت افغانستان، سعودی عرب جیسے ممالک سے کچھ مختلف نہ ہوتی۔ انجیل جلیل کے پیغام پر سخت قدغن ہوتی اور مشنریوں کا یہاں آنا ناممکن ہوتا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزی دور میں اس خطہ میں تمام انگریز افسر اور حکمران مسیحیت کے پرچار کے حق میں نہ تھے۔ کرنل نیکل سن پشاور میں اس امر کے سخت مخالف تھے کہ ایک بار انجیل کی بشارت دی جائے۔

۱۸۵۰ء کی دہائی میں سیالکوٹ میں کچہری کے پاس ایک گرجا گھر کو صرف اس خیال کے تحت منہدم کر دیا گیا کہ غیر مسیحی اس سے یہ مراد نہ لیں کہ ہندوستان میں انگریز ہندوؤں اور مسلمانوں کو جبراً مسیحی بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ حالانکہ بے شمار انگریز اپنی تجارت پر زیادہ توجہ دے رہے تھے۔ اور مسیحیت سے ان

کو، ور کا بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ سرتا مس رو کے ساتھ پادری ٹیری REV.
(TERRY) آئے اور پادری ٹیری نے خوب کہا کہ میری دلی خواہش ہے کہ میں
غیر مسیحیوں میں بشارت دوں لیکن کیا کروں میرے ہم وطن انگریزوں کی اپنی زندگی
میں تمام برائیاں پائی جاتی ہیں جن کی درستی مطلوب ہے۔

لیکن یہ بھی درست ہے کہ چند ایک سرکاری افسران کے دل خداوند کی
محبت اور اس کے خوف سے مالا مال تھے۔ انہوں نے آنے والے ہر مشنری کا پُر
خیر مقدم کیا۔ اور ہر ممکن مدد فرمائی۔ ان میں سے سرفہرست جان لارنس، ہنری
لارنس، میکلوڈ، نکلسن، ایڈورڈز تھے۔ جنہوں نے چرچ مشنری سوسائٹی سے
درخواست کی تھی کہ بشارتی کام پشاور میں بھی شروع کیا جائے۔ لیکن ایسی سوچ کے
مالک چند ایک تھے۔ یہ ہاتھ کی انگلیوں پر شمار کیے جا سکتے تھے۔ مگر پھر بھی اگر پنجاب
اور سرحد کی ابتدائی کلیسیا میں پروان چڑھیں تو یہ ان انگریزوں ہی کی کوشش کا نتیجہ
تھا۔ یعنی۔

۱۔ امریکن اور انگریز مشنری صاحبان کی کوشش سے
۲۔ چند انگریز افسران کی بدولت۔
۳۔ سیالکوٹ کنونشن کی روحانی نعمت سے
۴۔ اور مسیحی پنجابی علمبردار جن کا تذکرہ از بس لابدی ہے۔

دلو سنگھ پہلا پنجابی مسیحی، عماد الدین لاہز، پادری آئی ڈی شہباز، پادری
دینا ناتھ، جواہر مسیح، سکاٹ اور سوفٹ برادران۔ پادری کھڑک سنگھ، راجا تان
پور شام سنگھ، پادری آر چند بکمن احسان اللہ، ڈپٹی عبداللہ آتھم، کنہیا لال، بھگت
گنڈا مل۔

۱۸۵۰ء اور اس کے بعد ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور مذہبی حالت

ایک نظر ڈالی جائے تو اچھا ہوگا۔

ہندوستان کے اصل باسی اور باشندے وہ ہیں جنہیں آنے والے آریاؤں نے کول اور دراوڑ کا نام دیا۔ قدیم ہندوستان چار ذاتوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس کی وجہ بیرونی حملہ آور تھے۔ جو افغانستان اور ایران کے راستوں سے خاص کر درّہ خیبر کے راستے ہندوستان آئے۔ ان کا تعلق وسطی ایشیا سے تھا۔ وہ لوگ خوبصورت، دراز قد، دلکش خدوخال، تیکھے نقوش اور گورے رنگ کے تھے۔ فنونِ حرب سے واقف، بہادر اور جفاکش تھے۔ لیکن ہندوستان کے قدیم لوگ پست قد، موٹے نقش، کالے رنگ کے تھے اور اتنے جنگجو نہ تھے۔ اگر موازنہ کیا جائے تو قدیم ہندوستانی آریاؤں کے مقابلہ میں کسی طرح کھڑے نہ ہو سکتے تھے۔

بیرونِ ہند سے آنے والے لوگ، کشان، شاک، ترک اور افغان تھے۔ یہ آریہ نسل کے لوگ ہی متصور ہوتے تھے۔ یہ وسط ایشیا سے آئے اور ان کی آمد کئی صدیوں پر محیط تھی۔ ہندوپاک کا بڑا حصہ انہی کی نسل پر مشتمل ہے۔ یہ پنجاب، شمالی ہند، راجپوتانہ، گجرات، کشمیر اور افغانستان میں پھیل گئے۔ اور ان علاقوں میں حکمرانی کرتے رہے۔ انہوں نے قدیم باشندوں کو ان کے گھروں سے مار بھگایا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم لوگ، کول، دراوڑ، دکن، بنگال، مدراس، کیریلا یعنی جنوبی ہند کی طرف جا کر آباد ہو گئے۔ ہندوستان کے لوگوں کا اصل مذہب ہندو دھرم ہی تھا۔ وہ ایک خدا کی ہستی سے ناواقف تھے۔ وہ آگ، پانی، سورج، چاند، بادل اور بجلی کی پوجا کرتے تھے۔ اور مورتیوں اور بتوں کو بھگوان جانتے تھے۔ وہ چار ذاتوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے تھے۔

پنڈت (برہمن)

افضل ترین ذات جو مذہبی فرائض انجام دیتے تھے۔

کھشتری

جو جنگجو تھے۔ بیرونی دشمنوں سے لڑتے اور حکمرانی کرتے تھے۔

ویش

کھیتی باڑی کا کام ان پر منحصر تھا۔

شُودر

رذیل ترین کام کرنے والے لوگ گھروں کی صفائی، مُردار کی چمڑی اتارنا۔

آخری دو ذاتوں کے لوگ ہندوستان کے قدیم ترین باشندے شمار ہوتے تھے۔ یہ قریب قریب ہر صوبہ، ریاست، اور شہر میں پائے جاتے تھے۔ اونچی ذات کے لوگ ان سے نفرت کرتے تھے۔ اُن کے سایہ سے بھی دور رہتے تھے۔ رہن سہن یا اُن کے ساتھ کھانے پینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کڑی سے کڑی سزا کے مستوجب بھی ہوتے۔ اُن کی زندگی کوئی زندگی نہ تھی۔ کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ یہ شودر کہلاتے تھے۔

بشپ جے ڈبلیو پکٹ (J.W. PICKETT) اپنی کتاب ''ہند میں مسیحی عوامی تحریک'' میں لکھتے ہیں۔

کہ جب نچلی ذات کے کسی بھی طالب علم سے یہ دریافت کیا گیا کہ تم کیوں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہو تو وہ یوں گویا ہوا۔

''میرے تعلیم حاصل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میں بھی دوسرے لڑکوں کی

1. J.W. Pickett, Christian Mass Movement in India, Abingdon Press N.Y. page 65

طرح باعزت زندگی بسر کروں، مجھے لائن میں کھڑا نہ ہونا پڑے۔ اور کوئی مجھ سے نفرت نہ کرے''

بشپ پکٹ مزید لکھتے ہیں نیچ ذات کے لوگوں کو آج بھی نگاہ نفرین سے دیکھا جاتا ہے۔ شودر لوگوں کو گاڑی کے ڈبے میں نہ بیٹھنے دینا۔ اُن کے ساتھ سفر نہ کرنا، علیحدہ سکول قائم کرنا، دکانوں کا علیحدہ ہونا، شادی کے سلسلہ میں محتاط ہونا۔ اب بھی عام دیکھا جا سکتا ہے۔''

مہاتما گاندھی نے اور اُن سے پہلے بھگتی تحریک کے کارندوں نے چھوت چھات کے خلاف بہت زبردست آواز بلند کی۔ حالانکہ وہ خائف بھی تھے کہ نچلی ذات کے لوگ کہیں مسیحی مذہب کی طرف راغب نہ ہو جائیں۔ مگر دلی طور پر اس لعنت کو دور کرنے کے متمنی بھی تھے۔ کیونکہ اسی ذات پات سے عاجز آکر بیشتر ہندوؤں نے یا مسیحیت میں آنا پسند کر لیا یا اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ یہی تبدیلی مذہب اس بات کی غمازی کرتی ہے۔

غماز بن گئے ہیں آنسو غمِ نہاں کے

آنکھوں سے گر رہے ہیں ٹکڑے مری فغاں کے

سبب یہ تھا کہ ان دونوں مذاہب میں تو ذات پات کی سختیاں نہیں ہیں۔ دوسرے قدرے تحفظ بھی ہے۔ آج بھی مسیحیت اور اسلام میں لاکھوں کی تعداد میں آئے ہوئے لوگ ہندوستان کے قدیم باشندوں کی نسل سے ہیں۔ فرق تو اتنا ہے کہ اسلام نے چونکہ ہندوستان میں صدیوں راج کیا۔ کمترین لوگ اپنے معیار کو اونچا کرنے میں زیادہ کامیاب رہے۔ مگر مسیحی لوگ چونکہ ایک ڈیڑھ صدی گذر جانے کے بعد بھی کسی خاص التفات اور کرم و مہربانی سے محروم رہے اس لئے وہ آج بھی ویسے کے ویسے ہیں۔

اُن کی زبوں حالی کی تصویر دیکھنا مقصود ہو تو دیہاتوں میں جا کر ایک نظر ڈالنے سے دیکھی جا سکتی ہے۔ ان لوگوں کو عرفِ عام میں آج بھی پچھڑی اور کمی یعنی (BACKWARD) سمجھا جاتا ہے۔

نئی بشارتی تحریک کے سالوں میں ہندوستان میں جو مذہب پائے جاتے تھے اُن کا مختصر حال مندرجہ ذیل ہے۔

ہندومت

اس کی بابت پہلے بھی کافی ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن اتنا کافی ہے کہ ہندوستان کے لوگوں اور عوام کا قدیم ترین مذہب ہے۔ وہ خدا کی وحدانیت کے قائل نہ تھے۔ اور زیادہ تر بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اور مسئلہ آواگون پر یقین رکھتے تھے۔ رام اور لچھمن کو خدا کا اوتار مانتے تھے۔

اسلام

پہلی دفعہ اسلام ہندوستان میں ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کے حملہ کے وقت سے وارد ہوا۔ قاسم کے حملہ سے پہلے بھی ہندوستان میں مسلم لوگ موجود تھے۔ یہ خاص کر عربستان سے ہجرت کر کے تجارت کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ پرتگیزوں کے آنے سے پہلے خلیج فارس اور بحرِ ہند کے جہاز ران اور بادشاہ تھے۔ بلا شرکت غیرے وہ سمندری تجارت کے مالک تھے۔ ساحل مالابار کے قریب اُن کی بستیاں تھیں۔ محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کے بعد یعنی گیارہویں صدی کے بعد اسلام ہندوستان میں چھا گیا۔ اورنگ زیب کے عہد تک (۱۷۰۷ء) سلطنت قائم رہی اور اِن آٹھ صدیوں میں اسلام کے شیدائیوں کی تعداد کروڑہا تک پہنچ گئی اور وہ ۱۸۵۰ء میں ہندوستان کا دوسرا بڑا مذہب تھا۔ مسلمان خدا کی وحدانیت کے

مانتے ہیں اور رسول عربی کو آخری رسول مانتے ہیں۔

پارسی

پارسی لوگ ایران کے قدیم باشندے تھے۔ یہ آگ کے پجاری تھے۔ زرتشت کو پیغمبر مانتے تھے۔ چوتھی اور پانچویں صدی میں شاہ پور اعظم اور بہرام گور نے پہلے خود مسیحیت کی بیخ کنی کی۔ بعد میں اسلام بھی ایران میں آٹھویں صدی میں آ پہنچا تو زرتشتوں کا قلع قمع کر دیا اور زرتشتی لوگ بھاگ کر ہندوستان آ گئے۔ اور مالابار ساحل پر آباد ہو گئے۔ اگرچہ ان کی تعداد دنیا میں آج بہت کم ہے۔ کیونکہ زیادہ تر لوگ اسلام میں مدغم ہو چکے ہیں۔ آج کے ایرانی انہی زرتشتوں کی اولاد ہیں۔

سکھ

گورو نانک سکھ مذہب کے بانی تھے۔ ۱۴۶۹ء میں تلونڈی موجودہ ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ تیس برس کی عمر میں فقیر ہو گئے یہ بھگتی تحریک کے بہت بڑے محرک تھے۔ انہوں نے لوگوں کو توحید کی تعلیم دی۔ وہ ذات پات، بت پرستی اور بُری رسومات کے خلاف تھے۔ اُن کے پیروکار سکھ کہلانے لگے۔ ان کے دس گرو ہو گزرے ہیں۔ آخری گرو گوبند سنگھ تھے۔ ہر گوبند نے جو چھٹے گرو تھے سکھ مذہب کو ایک قومی مذہب بنا دیا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کے تحت اُنہوں نے پنجاب میں ایک زبردست حکومت قائم کی۔ اور ۱۸۳۹ء تک پنجاب کے حکمران رہے۔ آج دُنیا بھر میں سکھوں کی تعداد تقریباً ۷۵ لاکھ ہے۔ امرتسر ان کا مقدس مقام ہے۔

بدھ مت اور جین مت

چھٹی صدی قبل از مسیح بدھ مت اور جین مت ہندو مذہب کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بدھ مت کا بانی سدھارتھ تھا۔

بدھ مت کا سدھارتھ اور جین مت کا مہاویر ان دونوں مذاہب کے بانی تھے۔ دونوں خدا کی وحدانیت کے بارے میں خاموش ہیں لیکن نیک اعمال پر زور دیتے ہیں۔ دونوں ہی کسی جاندار کو دُکھ نہ دینا نیک چال چلن اور نیک سوچ پر زور دیتے ہیں

ہندوستان میں پیدا ہونے والے ان دونوں مذاہب میں سے بدھ مت نے کافی عروج حاصل کیا۔ لیکن بعد میں زوال پذیر ہوگیا اور پھر ہندوستان میں تقریباً نابود ہوگیا۔ آج اس کے پیروکار تبت، منگولیا، جاپان، چین، نیپال، برما، ویت نام اور تھائی لینڈ میں پائے جاتے ہیں۔ بدھ مت کے پیروؤں کی تعداد تقریباً ایک ارب ہے۔

جین مت ہندوستان سے باہر بہت کم پھیل سکا اور ان کی تعداد بہت کم ہے۔

ہندوستان کے اس قسم کے معاشرہ میں مسیحیت نے دم لینا شروع کیا لیکن ۱۸۵۰ء سے پہلے پنجاب کے علاقہ میں زیادہ تر آبادی مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی تھی۔ سکھوں کی تو اپنی حکومت اور زور تھا۔

بشارتی تحریک اور مختلف گروہ

پنجاب کا مطلب ہے ''پانچ دریاؤں کی سرزمین ہے اور یہ پانچ دریا ستلج، بیاس، راوی، چناب، اور جہلم ہیں۔

۱۸۶۵ء سے ۱۹۲۰ء تک برطانوی حکومت نے اس علاقہ میں نہروں کا جال بچھانا شروع کر دیا۔

آغاز نہری جال

روزی اور بہتر مواقع حاصل کرنے کے لیے مرکزی اور مشرقی پنجاب سے لوگ ان دیہات میں آباد ہونا شروع ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں شمال مغربی ہندوستان کو مغربی پاکستان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ایوب خان کے دور کے بعد ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔

پاکستان کے چار صوبوں میں آبادی کے لحاظ سے پنجاب سب سے بڑا اور زرخیز علاقہ ہے۔ اور رقبہ کے لحاظ سے بلوچستان سب سے بڑا مگر آبادی میں سب سے چھوٹا ہے۔ ۹۵ فی صد آبادی مسلمان ہے۔ قومی زبان اردو ہونے کے باوجود صوبائی زبانیں پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو بھی بولی جاتی ہیں۔ ۷۵ فیصد لوگ دیہاتی ہیں۔ انگریزی صرف ۵ فیصد سمجھ یا بول سکتے ہیں۔

۱۸۱۳ء میں ایک چارٹر کی رو سے لارڈ منٹو اول کے عہد میں مسیحی مذہب کے پرچار کی آزادی دے دی گئی تھی۔ لیکن اس کا ہرگز مطلب نہیں کہ انجیل کی بشارت اور پیغام دینا آسان کام تھا۔ اکثر اوقات مسیحی مبلغین پر حملے ہوئے۔ اس خدمت کے آغاز میں زیادہ سرگرمی انگریزوں نے دکھائی۔ اس لیے ہر سفید فام سے اہانت آمیز سلوک کیا جاتا تھا حالانکہ انگریز اس ملک میں تاجر اور حکمران کی حیثیت سے آئے تھے۔ لیکن فطری طور پر محکوم نے اپنی سرزمین پر کبھی کسی کو خوش آمدید نہیں کہا۔ یہی کچھ ان مغربی حکمرانوں کے ساتھ ہوا۔ دیگر اکثر انگریزوں کی زندگیاں غیر مسیحیوں سے بھی بدتر تھیں۔ جوا، شراب، ناچ رنگ، اور بدکاری جیسی تمام قباحتیں اُن میں پائی جاتی تھیں۔ ان عیوب کے پیش نظر امیر گھرانوں کے مسلم

ہندو اور سکھ بہت ہی کم مسیحی مبلغین سے متاثر ہوتے تھے۔ کیونکہ اُن کا اچھا خاصا
معیار زندگی تھا۔ اس لئے آنے میں ننگ سے بھی بہت کم لوگ مسیحیت کی طرف
راغب ہوئے۔ مسیحیت کی طرف راغب ہونے والے ہندوستان کے قدیم باشندے
تھے۔ یعنی کول اور دراوڑ وغیرہ۔ انہوں نے یہ نام تو نہ اپنایا کیونکہ ذات کے لحاظ
سے کئی کئی ذاتوں سے وابستہ تھے۔ اور یہ نئی ذاتیں تھیں۔ میگھ، سانسی، اچاڑی،
بھیل، کوہلی، کترین، گگلوے اور چٹری باس۔ ان ذاتوں میں تبلیغ و بشارت کے
کام کو بالتفصیل دیکھا جا سکتا ہے۔

۱:۔ میگھ (MEGS)

اس برادری میں بشارت کا کام ۱۸۵۹ء میں شروع ہوا اور دور جدید کی
مسیحیت میں انجیل کا پیغام سب سے پہلے میگھوں ہی کو سنایا گیا۔ یہ لوگ جموں کے
دامن گورداسپور، سیالکوٹ، گجرات کے اضلاع میں رہتے تھے۔ یہ لوگ اپنے آپ
کو کترین برادری سے افضل سمجھتے تھے۔ کیونکہ کترین برادری خاکروب تھی اور
غلاظت اُٹھانے کے پیشہ سے وابستہ تھی۔ میگھ مردار بھی کھا لیا کرتے تھے۔ مسلم
ہندو اور سکھ گھرانوں میں کام کرنا اور گوبر کے اوپلے تھاپنا اُن کے فرائض میں
شامل تھا۔

سب سے پہلے مختلف جگہوں پر رہائش پذیر میگھ لوگوں کی بجائے ظفروال
کے علاقہ میں رہنے والے میگھوں میں انجیلی بشارت دی گئی۔ یہ جگہ جندراں سے جو
نارووال سے شمال کی جانب تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر ہے۔

ان ہی ایام میں مستان سنگھ ایک نقلی گرو جو اسلام اور ہندومت کی تعلیم کو
نہیں مانتا تھا۔ اُس نے ایک نیا مذہبی فلسفہ پیش کرنا شروع کر دیا۔ اُس کے اپنے
خیال اور احوال یہ تھے کہ آدمی سے ارفع کوئی شے نہیں اور موت کے بعد انسان

کے لئے کوئی سزا نہیں۔ گویا وہ روز قیامت کا منکر تھا۔ اُس کے یہ ڈھونگ رچانے کی وجہ یہ تھی کہ میگھ برادری کے لوگ اُسے گرو مان کر اس کی ضروریات زندگی کا خیال رکھیں۔ لیکن میگھ برادری اُس کے اس فلسفہ کو سمجھ نہ سکی اور حیرانی اور پریشانی میں مبتلا ہو گئی۔ ابھی یہ پیچیدگی دور نہ ہوئی تھی کہ چار ماہ کے بعد خوش قسمتی سے ایک مسیحی مبلغ جواہر مسیح مقدس مرقس کی انجیل کی تعلیم میگھوں کو سمجھانے لگا۔ اور تین دن تک خداوند یسوع کی تعلیم اور اُن کی پاکیزہ اور معجزات سے پُر زندگی کی بابت بیان کرتا رہا۔ وہاں سے روانہ ہوتے وقت میگھوں کو سیالکوٹ آنے کی دعوت دی۔ وہ خوشی سے آئے اور مشنری صاحبان سے کلام سُنا۔

آٹھ دن گزرنے کے بعد جی ڈبلیو سکاٹ[1] جو ہندوستانی تھا۔ اور لدھیانہ یتیم خانے میں پلا تھا۔ وہ جواہر مسیح کے ساتھ جندراں گیا۔ تین سو کے قریب لوگوں نے کلام سُنا اور بہت متاثر ہوئے۔ سب سے پہلے مسیح خداوند پر ایمان لانے والا شخص پپو تھا۔ پھر اُس کے ساتھی بھی خداوند پر ایمان لانے کے لئے تیار ہو گئے۔

لیکن وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مخالفین کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ طوفان بدتمیزی اُٹھ کھڑا ہوا۔ لوگ پپو کے گرد ہو گئے۔ ایک شخص (DIALA) دیالہ نے پپو کو اتنا زدوکوب کیا کہ پپو قریب المرگ ہو گیا۔ اُس کے ساتھی اس خوف سے ایمان سے پھر گئے۔ وہ مظلوم چند دنوں کے بعد خالق حقیقی سے جا ملا۔ لیکن مرنے سے پہلے اپنے بھائی بھجنا کو بلا کر اُسے تاکید کی کہ وہ اس نئے ایمان پر قائم رہے۔ کیونکہ نجات صرف مسیحیت ہی میں ہے۔ بھجنا کے ساتھ اُنکے دوست نمبردار رام کا بیٹا کنہیا نے عہد کیا کہ ہم دونوں مسیحی ہو جائیں گے خواہ ہمیں کتنا ہی ستایا جائے۔ وہ مسٹر سکاٹ کو ڈھونڈنے نکلے اور کئی میل کی مسافت بھوک اور پیاس کی شدت سے

---

[1] پروفیسر ایس۔ جے امام دین۔ فدائے صلیب، مسیحی اشاعت خانہ لاہور ص ۱۶

نڈھال ہو کر بھی طے کر کے سیالکوٹ سے چھ میل دور اُن سے کر بپتسمہ لیا۔

کنہیا جب واپس جندراں پہنچا تو اُس کے بیوی بچے چھین لے گئے۔ مقدمہ چلا۔ سکاٹ نے اِس سلسلہ میں بہت مدد کی۔ کنہیا کے بچے واپس مل گئے۔ اور مسیح خداوند کے قدموں میں سرنگوں ہو گئے۔ مگر بھجنا بیچارے کی بیوی کو زبردستی کسی اور کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ بھجنا اس قدر دُکھ پا کر بھی ایمان پر قائم رہا۔

۱۸۸۱ء میں دونوں کی گواہی سے چودہ سکھوں نے مسیح خداوند کو قبول کر لیا۔ اور یوں جندراں، سکاٹ گڑھ، نیا پنڈ، سکھو چک اور تمحل میں:

۱۸۸۱ء میں	۲۷ سکھوں نے بپتسمہ لیا		
۱۸۹۰ء میں	۶۸	"	"
۱۸۹۵ء میں	۸۵	"	"
۱۹۰۰ء میں	۹۰	"	"
۱۹۰۵ء میں	۹۵	"	"

اِس کے بعد سکھوں کے درمیان بشارت کا کام ٹھنڈا پڑ گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ مشنری انچارج فوراً بپتسمہ کے خلاف تھے اور اِس کی بجائے بشارت کو ترجیح دینے کو مقدم جانتے تھے۔ انہوں نے سکول اور مدرسے کھولنے کی خاص پروا نہ کی۔ نیز ۱۹۰۸ء کے بعد آریہ سماج نے جب دیکھا کہ سکھ مسیحیت قبول کر رہے ہیں۔ تو اُنہوں نے سکھوں کے پاس آ کر کہنا شروع کر دیا کہ وہ ہندو ہیں اور اُن میں اور ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں۔ اس سال ۲۲۰۰۰ سکھوں نے دوبارہ آریہ سماج میں شمولیت اختیار کر لی۔

خداوند نے کنہیا لال اور بھجن کو بڑی برکت دی۔ اُن کے بچے آسمان کی بلندیوں تک پہنچے۔ کنہیا لال سکاٹ گڑھ کا نمبردار بنا دیا گیا۔ پادری گنڈا مل

کنھیالال ہی کے فرزند تھے۔ کنھیالال ۱۹۱۲ء میں وفات پا گیا۔ اُس کی قبر سرگودھا میں موجود ہے۔

ظفروال سے بہت مسیحی خاندان نکلے۔ سچ تو یہ ہے کہ ظفروال مسیحیت کا انطاکیہ تھا۔

میگھ برادری میں سب سے زیادہ کام یونائیٹڈ پریسبٹیرین چرچ اور چرچ آف سکاٹ لینڈ نے کیا۔ اور سیالکوٹ، ظفروال، گوجرانوالہ اور پسرور کے علاقوں کے مسیحی انہی چرچز کے طفیل ہیں۔

۲:۔ کمترین برادری

یہ بات عام مشاہدے میں آئی ہے کہ نفرت کے اظہار کے لئے کسی کمترین کو اس نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن اس خیال کو بالائے طاق رکھ دینا چاہئے کیونکہ یہ ایک پیشہ تھا۔ بلکہ جیسے آج کل صفائی کرنے والے انسان کو بلاوجہ یہ نام دے دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ دراصل ایک برادری تھے۔ ایک گروہ تھے جو اس علاقہ پنجاب میں سالہا سال سے بسے ہوئے تھے۔ اور یہی وہ لوگ تھے جو ہندوستان کے قدیم باشندے تھے۔ اور اگر ان کو کول اور دراوڑ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ آج ان لوگوں سے نفرت کر کے انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ ضرب المثل یاد رکھنی چاہیے۔

''گناہ سے تو نفرت کرو مگر گنہگار سے نہیں''

لیکن ہماری سوچ اس کے برعکس ہے۔ خداوند یسوع کو دنیا میں امیر لوگوں نے مصلوب کیا اور غریبوں نے اُسے اپنے گھر میں اُتارا۔ اُس کی نسی اُسے دیکھا اور اسکے پیرو بنے۔ ماضی کا امیر اور آج کا کھاتا پیتا انسان اگر غریب سے نفرت کر کے کم ظرفی کا مظاہرہ کرنے پر تلا ہوا ہے تو اُسے مغرور اور امیر آدمی کی کہانی کبھی بھولنی نہیں چاہیے۔

اس برادری کے لوگ پنجاب کے مختلف شہروں میں بستے تھے۔

۱۸۸۱ء میں سٹوارڈ (STEWARD) صاحب کے کہنے کے مطابق پنجاب میں ان لوگوں کی تعداد دس لاکھ اٹھہتر ہزار سات سو انتالیس (۱۰،۷۸،۷۳۹) تھی اور وہ اس صوبہ کی کل آبادی کا آٹھواں حصہ تھے۔

یہ لوگ برادری کی صورت میں رہتے تھے۔ ان کی اپنی پنچایت تھی جس کے لئے سرپنچ چنا جاتا تھا۔ جو اُن کے مسائل یا جھگڑوں کا فیصلہ کرتا تھا۔ جس کی بدولت وہ مقدمہ بازی سے بچے رہتے تھے۔

وہ غلاظت کے ڈھیروں کی منتقلی اور صفائی کا کام کرتے تھے۔ مرے ہوئے جانور اُٹھانا بھی اُن کے فرائض میں شامل تھا۔ یہاں تک کہ ہر قسم کا ذلیل کام اُن کی ذمہ داری میں شامل تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کھیتوں میں کام کرکے غلامانہ زندگی کو اپنے گلے کا ہار بنائے ہوئے تھے۔ سکھ لوگ اپنے آپ کو ان سے ارفع جانتے تھے۔ اور وہ ایسے کام کرنے سے کتراتے تھے۔

امیر لوگ اِن کو بچا ہوا کھانا دینا اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ ان کا کسی بڑے آدمی کے پاس جاکر برابر بیٹھنا محال تھا۔

اسی برادری کے لوگ گاؤں میں الگ ایک آبادی کی صورت میں رہتے تھے۔ اور آج بھی یہی صورتِ حال ہے۔ انہیں عام راستے استعمال کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اُن کا اپنا کنواں تھا۔ اُونچے ٹیلوں پر عبادت کرتے اور بالمیک کو خدا کا نائب سمجھتے تھے۔ اُن کے احوال اور عقائد کچھ اِس قسم کے تھے۔

۱۔ خدا ایک ہے۔

۲۔ فرشتے ہیں۔

۳۔ بالمیک یا بالے شاہ اُن کا نبی ہے۔ جو خدا اور انسان کا درمیانی

۴۔ روح موت کے بعد جسم سے علیحدہ ہو کر خدا کے پاس چلی جاتی ہے۔

۵۔ قیامت پر یقین رکھتے تھے۔

۶۔ جمعرات کا دن اُن کا عبادتی دن ہوا کرتا تھا۔

گورڈن اور سٹوارڈ کا یہ بھی خیال ہے کہ مسیحی تحریک کے آغاز میں اُن کے ٹھوس ایمان کا پتہ لگایا گیا۔ مگر خداوند کی ذات کے بارے میں اُن کے دماغ کورے تھے۔

آریہ سماج نے ان لوگوں کو ہندو مت کا خاص حصہ شمار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور ۱۹۰۸ء کے بعد انہیں اور میگھ قسم کے لوگوں کو ہندو کہنا شروع کر دیا تھا۔ تاکہ اُن میں سے احساس کمتری کو ختم کیا جا سکے۔ اور وہ مسیحیت کے دائرے میں جانے سے گریز کریں۔

بہرحال اُن کے عقیدہ بدلنے سے اُن کی حالت کبھی تبدیل نہ ہوئی۔ نفرت کا اظہار قائم رہا خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہوتا تھا۔

کمترین میگھ ہندو ہو جاتا تو اُسے بھرشٹ سمجھا جاتا۔

مُسلمان ہو جاتا تو اُسے مُصلی MASALLI

سکھ ہو جاتا تو اُسے مذہبی سکھ کہتے

کمترین تحریک اور بشارت کا کام

اس تحریک کی بانی یو پی مشن تھی۔ اور اس نے یہ تحریک ۱۸۷۲ء میں شروع کی۔ اسی مشن یونائیٹڈ پریسبٹیرین نے زیادہ کام سیالکوٹ، ظفروال، ناروال، گوجرانوالہ، پسرور ڈسٹرکٹ اور شہروں کے نواحی دیہات میں کیا۔

اس برادری سے دتہ DITTA پہلا شخص تھا جس نے ۱۸۷۲ء میں مسیح

خداوند کو قبول کیا۔ وہ مرالی کے قریب شاہ آباد کے کا رہنے والا تھا۔ مسز سوئکل مارٹن نے اُسے بپتسمہ دیا۔ یہ اس تحریک کا پہلا ثمر تھا۔ جس کی بے حد مخالفت کی گئی وہ بپتسمہ پانے کے بعد فوراً اپنے لوگوں میں شاہ آباد کے چلا گیا۔ دتہ بے چارہ چونکہ ایک ٹانگ سے معذور تھا۔ اُس کی بڑی سالی نے مسیحی ہونے کا طعنہ یوں دیا تیری ایک ٹانگ لنگڑی ہے دوسری بھی ہو جائے گی۔ دتہ نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ کوئی اس کے پختہ ایمان کو متزلزل نہ کر سکا۔ وہ برابر پادری سوئکل سے ملتا اور کلام مقدس سیکھتا رہا۔ اسی سال اُس کی وساطت سے کریم بخش چوکھاٹ اور پریم کلیسیا میں مل گئے۔ دتہ نے گوجرانوالہ اور گورداسپور میں اپنی برادری میں گھومنا شروع کر دیا۔ اور خداوند کی قدرت اور اُس کے فضل کا ذکر ہر ایک سے کرتا رہا۔ اُس کا اثر یہ ہوا کہ ۱۸۹۱ء تک اسی برادری کے تقریباً ۱۰۶۵ لوگوں نے یو۔ پی۔ چرچ کے مناد اور خادم الدینوں سے جن میں مشنری بھی شامل تھے بپتسمہ لیا۔

یہ بات نہایت حوصلہ افزا ہے کہ یو۔ پی چرچ نے سب سے زیادہ غریب اور پسماندہ لوگوں کو مسیح خداوند کے لئے جیتا۔ غریبوں کے درمیان خدمت کے ذریعہ زیادہ فصل تیار کی اور خدا کے نام کو جلال دیا۔

۱۸۹۱ء میں یو۔ پی چرچ میں شمولیت اختیار کرنے والے لوگوں کی تعداد یہ تھی۔

سیالکوٹ	۵۹۵	مغربی گوجرانوالہ	۲۵۰
پسرور	۲۳۷	جہلم	۵۳
ظفروال	۹۱۱	جھنگ	۴
مشرقی گوجرانوالہ	۲۰۳۳	راولپنڈی	۲۰

یو۔ پی کلیسیا کے لوگ بڑی سکیم کے ساتھ مسیحیت میں آنے والے لوگوں

ی تعلیم کے کام کو جاری رکھے ۔ اور انہیں بکھرنے نہ دیتے تھے اور ہر قسم کے

ب لوگوں میں پھیل جاتے اور پنجاب میں رہنے والے چتوال، سانسی، ڈوم، تجزی

ان، بجار، کتریں اور میگھوں میں گھوم پھر کر خدمت کا کام انجام دیتے تھے ۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یو۔ پی چرچ نے کتریں برادری کو، چرچ آف

ٹ لینڈ نے میگھ کو اور سی۔ ایم۔ ایس نے ڈوم کو سنبھالنے پر توجہ دی اور بشارت

کا کام پھیلتا چلا گیا ۔

یو۔ پی۔ مشن میں ابتدائی کام کرنے والوں میں لدھیانہ یتیم خانے کے دو

ہندوستانی بھائی۔ ڈبلیو۔ کاٹ اور ای۔ پی۔ سوفٹ (E.P.SWIFT) تھے

جنہیں ۱۸۵۹ء میں خادم الدین کی خدمت سونپی گئی تھی ۔

یو۔ پی۔ چرچ میں بشارتی کام کی ترقی کے لئے مندرجہ ذیل طریقہ سے

کوشش کی گئی ۔

۱۔ نومرید اور بپتسمہ یافتہ لوگوں کو خدمت کے لئے تیار کیا جائے ۔

۲۔ ۱۸۷۷ء میں گوجرانوالہ میں تھیولاجیکل سیمنری کھولی گئی اور ڈاکٹر (J.S BARR) اس کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے ۔

۳۔ انجیل جلیل کے پیغام کے لیے دیہات پر زیادہ توجہ دی گئی اور دیہاتی لوگوں کو ان کی جماعت کے لیے تیار کر کے ان ہی کے درمیان تعینات کیا گیا۔

۴۔ ہندوستانی مناّدوں اور پادریوں کے لیے کوشش کی گئی کہ وہ خود کفالت کے (self support) اصول کے تحت اپنے اپنے گروہ میں کام کریں ۔

۵۔ ایک مشنری کے ہمراہ سیالکوٹ، گوجرانوالہ، ظفروال اور پسرور کے علاقہ میں پندرہ سے تیس کارندے ہوا کرتے تھے ۔ ۱۸۹۲ء میں چالیس کارندے

صرف پسرور کے علاقے ہی میں خدمت پر مامور تھے۔

۶۔ پرائمری اسکولوں کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی۔ ایمان میں پختگی کے خیال سے ۱۸۸۵ء میں ۵۳ سکول کھولے گئے جن میں مسیحی بچوں کو تعلیم دینے کے لئے لایا جاتا تھا۔ بائبل مقدس کے سکھانے پر خاص طور سے زور دیا جاتا تھا۔

۷۔ ۱۸۸۱ء میں دو ہائی سکول سیالکوٹ شہر میں تعمیر کیئے گئے۔ ایک سی۔ ٹی۔ آئی اور دوسرا حاجی پور کا بورڈنگ ہاؤس جو مس الزبتھ گورڈن نے قائم کیا تھا۔ اسے حاجی پور کرسچن سکول کا درجہ دیا گیا۔ بے شمار لڑکے اور لڑکیوں نے ان اسکولوں سے فیض حاصل کیا۔ آج یہ دونوں سکول قومی تحویل میں ہیں[1]۔

۸۔ ۱۸۸۶ء میں انجیل جلیل کا پنجابی ترجمہ کیا گیا۔ اور ایک سال میں چاروں اناجیل کو پنجابی زبان میں ڈھال لیا گیا۔

آہستہ آہستہ یہ کام یہاں تک ترقی کر گیا۔ کہ فیصل آباد ۱۸۹۵ء، حافظ آباد ۱۸۹۷ء، خانقاہ ڈوگراں ۱۹۰۰ء، سانگلہ ہل ۱۹۰۱ء اور سرگودھا میں ۱۹۰۵ء میں نئے اسٹیشن قائم کر دیے گئے۔ انہی سالوں میں پسرور، سیالکوٹ اور گورداسپور سے لوگوں کو ہجرت کروا کر اُن گاؤں میں لے جایا گیا جو نئے آباد کیئے گئے تھے۔ دو نہروں کے باعث زمیندار حلقہ میں آ گئے۔ یہ خُداوند کا انتہائی فضل تھا کہ پسماندہ لوگ زمینوں کے مالک بن گئے۔ مُفت ہاتھ لگی چیز بے قدر ہو کر رہ گئی۔ پاکستان کے معرض وجود میں آ جانے کے بعد افسوس کی بات یہ ہوئی کہ لوگوں نے یہ زمینیں اونے پونے داموں میں فروخت کر کے اپنے پُرانے پیشے یعنی جاروب کشی کو اپنا لیا۔ مگر شکر ہے کہ وہ ایمان پر قائم رہنے کی وجہ سے مسیحی کہلاتے رہے۔

---

[1] سی۔ ٹی۔ آئی ۱۹۹۸ء میں کلیسیا کو واپس مل گیا

کلیسیا میں بیداری کی تحریک

تحریک بیداری جو بیسویں صدی میں شروع کی گئی وہ کلیسیا کے لیے روحانی بیداری بن گئی۔

۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۴ء تک کے سالوں میں چند ایک مشنری صاحبان اور دو ہندوستانی سیمنری طالب علموں نے روح القدس کی بھرپوری سے کلیسیاء کو بیدار کرنا چاہا۔

ہوا یوں کہ ۱۸۹۶ء میں جنرل بوتھ جو سلویشن آرمی کے بانی تھے۔ انہوں نے آکر امرتسر میں تہلکہ مچا دیا۔ جنرل بوتھ ایک شعلہ بیان اور سحر طراز مقرر تھے۔ انہوں نے اپنی روحانی تقاریر سے امرتسر اور گردونواح کے شہروں کو خداوند مسیح کے لئے بیدار کر دیا۔ اُس کا مترجم نارووال کا ایک مسلمان شخص احسان اللہ تھا جو پہلے اُسے انگلستان میں ملا تھا۔ وہ جنرل بوتھ کے پیغامات کا ترجمہ کیا کرتا تھا۔ آخر کار اُس نے یہ اقرار کر لیا کہ میں بے ایمان رہ کر خداوند کی قدرت اور روح پرور پیغام کا ترجمہ نہیں کر سکتا۔ مجھے اِس کام کو سرانجام دینے کے لئے خداوند پر ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ اِس بھید کے انکشاف کے بعد اُس نے خداوند کو پا لیا اور آئندہ سالوں میں وہ ایک زبردست پیامبر بن گیا۔

آرچڈیکن احسان اللہ کا تعلق چرچ آف انگلینڈ سے تھا۔

خداوند کو قبول کر لینے کے بعد احسان اللہ کو دو سیمنری طلبا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اُن کے نام بھولا اور ملوچند تھے۔ یہ تینوں ایک دوسرے سے خاصے واقف تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ خداوند انہیں کسی خاص مقصد کے لئے بلا رہا ہے۔

سیالکوٹ کنونشن

روحانی بیداری کے احساس نے مشنری صاحبان کو ابھارا۔ کلیسیا جو ابتدائی مراحل میں سے گزر رہی ہے اُسے روحانی طاقت اور خوراک کی اشد ضرورت ہے۔ ان دنوں امریکن پریسبٹیرین مشنری جان ہائیڈ جو دعا گو ہائیڈ کے نام سے مشہور ہوا سیالکوٹ میں مقیم تھا۔ اُسے اس روحانی تقویت کا شدت سے احساس تھا لہٰذا انہوں نے چرچ آف سکاٹ لینڈ کے دو مشنری رابرٹ پیٹرسن جارج ٹرنر GEORGE TURNER اور اینگلیکن چرچ کے احسان اللہ کو ساتھ ملا لیا۔ وہ سب دن رات (۳۰ دن) متواتر ہنٹر میموریل چرچ کے اندر دعا میں ٹھہرے رہے۔ روح القدس کی نعمت کیلئے دعا گو رہے۔ اس رفاقت و شراکت کو دیکھ کو بہت سے پاکستانی، مشنری اور (۸۰) اسی سالہ بوڑھا کنہیالال (جندراں ظفروال سے) آکر تین دن ان کے ساتھ دعا میں شریک رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۰۴ء میں پہلی سیالکوٹ کنونشن کا انعقاد ہوا۔ جان ہائیڈ، رابرٹ پیٹرسن، جارج ٹرنر، احسان اللہ اور پادری آئی ڈی شہباز (امام دین شہباز) اس کنونشن کے روحِ رواں تھے۔

تین سو کے لگ بھگ مشنری اور ہندوستانی خادم الدین اس کنونشن میں شریک ہوئے۔ خداوند کے پاک روح کی بارش ہوئی۔ عوام میں سے جن لوگوں نے شرکت کی ان کی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی۔ ایمانی پختگی کا یہ عالم تھا کہ وہ لوگ بکثرت تمام ساری ساری رات دعا میں ٹھہرے رہتے تھے۔ کلیسیا روحانی قوت میں مضبوطی حاصل کرتی گئی۔ آئندہ برسوں میں میگھ اور دوسری برادری کے لوگ ایک انبوہ کثیر کی صورت میں کنونشنوں میں شرکت کر کے کلیسیا کے لئے خوشی اور رونق کا باعث بنتے رہے۔

اس بیداری کا اثر دور رس تھا۔ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۰ء تک فیصل آباد اور شیخوپورہ میں بھی لوگوں نے مسیح خداوند کو پالیا۔ بپتسمہ لیا اور مقدس اندریاس کی طرح اپنے بھائیوں سے جاکر کہا کہ ہم کو خرستس یعنی مسیح مل گیا۔ اور یوں گردونواح کے شہروں میں شہرت پھیلتی چلی گئی۔

کلیسائے پاکستان ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنی رہی۔ کہ یہ بیرونی کلیسا (IMPORTED CHURCH) ہے۔ اس کا اپنا کریکٹر یا خصوصیت نہیں بلکہ آج بھی اسے پاکستانی کلیسا کا نام دینا مشکل ہے۔ کیونکہ دوسروں کے رحم وکرم پر جینے والے۔ دوسروں کے دست نگر ہونے والے اپنے نام سے بے بہرہ رہتے ہیں۔

سیالکوٹ کنونشن کی خصوصیات حیرت انگیز تھیں۔ ایک منجھے ہوئے پنجابی شاعر پادری آئی۔ ڈی شہباز نے زبوروں کا نہایت معنی خیز اور پُر تاثیر ترجمہ کیا۔ نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ راگوں میں بھی ڈھال دیا۔ یہی زبور سیالکوٹ کنونشن کی زینت بنتے رہے۔ پنجابی لوگوں کے لیے قابلِ فخر شاعر پادری صاحب کے زبور ایک بہت بڑی نعمت تھے اور ہیں۔

۱۹۰۵ء میں تین ہزار جلدیں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ زبور اَن پڑھ لوگوں کے لئے گانا نہ صرف آسان تھا بلکہ خوشی کا باعث بھی تھا۔ اس قدر زمانہ گزر جانے کے باوجود آج تک اِن کی چاشنی اور مٹھاس میں ذرہ بھر فرق نہیں آیا۔ اور وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ رہتی دنیا تک نہ آئے گا۔ عظیم شعراء نے بھی نہ تو آج تک اعتراض کیا ہے اور نہ اس کو تبدیل کرنے کی جسارت کی ہے۔ اس سے یہ حقیقت ہویدا ہوتی ہے کہ واقعی اُن دنوں خداوند کا پاک روح اپنے لوگوں پر ابر بن کر چھایا رہتا تھا۔

اس عظیم شاعر کا زمانہ ۱۸۵۴ء تا ۱۹۲۱ء ہے۔ آپ ۱۸۸۲ء میں پادری کے عہدہ پر متمکن ہوئے اور سیالکوٹ شہر میں فرسٹ یو۔ پی چرچ کے پینتیس سال تک پاسبان رہے۔ ۱۹۲۱ء میں اس پاسبانی خدمت اور زبوروں کی چاشنی سے دنیا کو روشناس کروانے کے بعد اپنے خداوند کے پاس لوٹ گئے۔ اور ضلع سرگودھا میں دفن ہوئے۔ اس خدمت کو بہت سراہتے ہوئے اور سند قبولیت کے طور پر امریکن یونیورسٹی نے انہیں علم الٰہیات کی ڈگری عطا کی جس سے انہیں اس علم کا ڈاکٹر قرار دیا گیا۔

ڈاکٹر پادری آئی۔ ڈی شہباز خود پنجابی تھے۔ اور سیالکوٹ کنونشن شروع کرنے میں ان کا بڑا کردار ہے۔ یہ کنونشن آج بھی جاری و ساری ہے۔ اور تمام کنونشن جو پاکستان میں منعقد ہوتی ہیں۔ ان کی ماں تصور کی جاتی ہے۔

شیڈول کاسٹ (سندھ کا اچھوت)

پاکستان کے قیام کے بعد پنجاب سے تقریباً تمام ہندو اور سکھ ہجرت کر کے بھارت چلے گئے۔ آج شاید معدودے چند ہندو خاندان پنجاب میں ہوں گے۔ لیکن سندھ میں آج بھی ہندو لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ سندھ میں ہندوؤں کی موجودگی اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ سندھی لوگوں نے تقسیم ہند کے وقت اُن کو برداشت کئے رکھا اور اُن کا جان و مال محفوظ رہا۔ یہ ہندو غریب قبائل میں بٹے رہے۔ اندرون سندھ اُن کی تعداد زیادہ ہے۔ اپنی اپنی زبان اور بولی بولتے ہیں۔ معیار زندگی اس حد تک گرا ہوا ہے کہ اگر اُن کے حسب و نسب کا جائزہ لیا جائے تو وہ بھی ہندوستان کے قدیم باشندوں سے جا ملے گا۔ کئی نسلوں سے وہ ان پڑھ چلے آ رہے ہیں۔ بت پرستی اور ٹونا ٹوٹکا عام ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے کچھ ہاری ہیں جو کھیتی باڑی کے کام پر مامور ہیں۔ نقل مکانی کرنے والے قبیلے بھی عام ہیں۔

اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے ہر نوعیت کا کام کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ
ہندو جن کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔ ان میں شاذ شاذ لوگ ہیں جو فارغ البال اور
خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں۔ تعلیم بھی ان کے مقدر میں نہیں۔

پاکستانی کلیسیا نے ان لوگوں کی ایسی زندگی سے متاثر ہو کر ان کے
درمیان کام کرنے کی ٹھان لی۔ کلیسیائی قیادت کو کبھی بھی یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ
انہوں نے کوئی معرکہ سر کرلیا ہے۔ اس کے باوجود ابھی بہت کام کرنا باقی ہے۔
اور بشارت دینے کے دروازے ہر روز بند ہوتے چلے جارہے ہیں۔

بشارتی تحاریک کا تفصیلاً جائزہ لیا گیا ہے جو پنجاب میں شروع ہو کر تقریباً
پچاس پچپن سال تک جاری رہیں۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پہلے مسیحی
لاہور اور سیالکوٹ سے آکر سندھ میں آباد ہو چکے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو
ہندوستان سے آئے تھے۔ انہوں نے یہیں رہنے کو مناسب سمجھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ
سندھ کے زیادہ مسیحیوں کی تعداد کا تعلق سیالکوٹ کے علاقہ سے ہے۔ بعد میں
دوسرے علاقوں ساہیوال، ملتان اور فیصل آباد سے آ آکر کراچی یا سندھ میں آباد
ہوتے رہے۔ حال ہی میں سندھ میں چند ایک نئے گاؤں / دیہات آباد کئے گئے
ہیں۔ ان میں آباد ہونے والے مسیحیوں کی تعداد کا تعلق زیادہ تر پنجاب سے ہے۔

جب پنجاب میں بشارتی تحاریک کا آغاز ہوا تو ان میں پیش پیش
پریسٹیرین اور چرچ آف سکاٹ لینڈ کے مشنری تھے۔ انگلیکن بہت بعد میں
آئے۔ یعنی ۱۸۸۵ میں خدمت کا کام شروع کیا۔ اور نارووال کے علاقہ میں
مصروف ہو گئے۔ حالانکہ اس علاقہ میں تبلیغ و بشارت میں پریسٹیرین ہی نے پہل
کی تھی۔ لیکن ۹۰-۱۸۸۹ء میں ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت یہ علاقہ انگلیکن کے
حوالہ کر دیا گیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان مشنریوں نے نئے ولولہ اور جوش کو

بروئے کار لا کر بہت ساری روحوں کو خداوند کے لیے جیتا۔ اس میں سیکڑوں انسانوں کو خداوند کے قدموں میں لانے کا سہرا نیک و پارسا انسان پادری رولینڈ بیمین کے سر ہے۔ انہوں نے نارووال اور مینی نگری میں طویل عرصہ تک خدمت کی۔

سندھ میں بشارت کے کام میں اینگلیکن چرچ سبقت لے گیا۔ بشپ چندورے جو خود ایک خوشحال ہندو گھرانے سے مسیحی ہوئے تھے۔ بعد میں کراچی اور حیدرآباد کے پہلے پاکستانی بشپ بنے۔ یہ ۱۹۶۸ء کا واقعہ ہے۔ اس عہدہ پر تعینات ہونے سے پہلے انہوں نے اس علاقہ میں بڑی دلچسپی سے بشارتی کام کیا۔ اس کام کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

سندھ میں شیڈول کاسٹ یا ہندوؤں میں کام ۱۹۲۰ء کی دہائی (۱۹۲۵ء) میں شروع ہوا۔ ہندو مختلف قبیلوں میں بٹے تھے۔ ان قبیلوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔	میگھ وار	MEGHWARS
۲۔	بھجیا	BAJANIAS
۳۔	وگاری	VAGARIES
۴۔	کچھی کوہلی	KUTCHI KOHLIES
۵۔	بھیل	BHILS

۱۹۲۵ء میں کراچی میں کام شروع کرنے کے تھوڑی دیر بعد میگھ وار کے تین اشخاص نے بپتسمہ حاصل کیا۔ ہیرالال نے اپنی زندگی اسی کام کے لئے وقف کر دی اور ۱۹۴۰ء تک اپنا کام جاری رکھا یہاں تک کہ خداوند کی طرف سے کوچ کا بلاوا آ گیا۔ تین چار میگھ واریوں نے حال ہی میں خداوند کو قبول کیا ہے۔ مگر اسے

زیادہ مشتہر نہیں کیا گیا۔ بلکہ بہت خاموشی سے یہ کام انجام پایا۔

۱۹۳۰ء میں کرائسٹ چرچ کراچی نے پادری سی ہاسکل اور مس ایل سمتھ REV. C. HASKELL & MISS L. SMITH کی وساطت سے میگھواڑ قبیلے کے درمیان کام شروع کیا۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ۵۱۶ کو بپتسمہ دیا گیا۔ لیکن ان کی غیر موجودگی میں اس کام کو اچھے طریقے سے نہ سنبھالا گیا۔

مذکورہ چرچ نے وگاری لوگوں میں بھی دلچسپی لی جو کراچی ہی میں مقیم تھے۔ ۱۹۳۷ء، ۱۹۵۷ء تک بیس سالوں میں ۱۲۶ لوگ دائرہ مسیحیت میں داخل ہوئے۔ ان میں تعلیم دینے کی پیش رفت ہوئی اور یہ کام آج بھی جاری ہے۔

بھی کوہلی قبیلہ میں کام شروع کرنے والا بھیل قبیلہ کا ایک شخص (KARA) تھا۔ وہ موسیقی اور سنگیت کا دلدادہ تھا۔ اُس کی یہ خوبی دلچسپی اور محنت بہت سے کوہلیوں کو مسیح خداوند کے قدموں میں لے آئی۔ اُس نے ایمان کے بل بوتے پر کلام پاک کا مطالعہ انتہائی دلچسپی سے کیا اور ۱۹۵۱ء تک تقریباً ۲۰۰ کوہلیوں نے مسیحیت میں قدم رکھا یہاں تک کہ چودہ دیہات نے سندھ سے بپتسمہ لینے کی فرمائش کی، جو قبول کر لی گئی۔ اور ۱۹۷۳ء تک بپتسمہ یافتگان کی تعداد گیارہ سو تک پہنچ گئی۔

بھیل اور پارکری کوہلی

میرپور خاص کے علاقہ سے ۱۹۵۹ء میں چار بھیل ایمان لائے۔ بدین کے علاقہ میں ۱۹۶۹ء میں چونسٹھ بھیلوں نے اور ۱۹۹۳ء میں آٹھ سو بھیلوں نے خداوند یسوع کو مکتی داتا مان لیا۔

پارکری کوہلی علاقہ میں رومن کیتھولک کا بشارت کا کام رنگ لایا اور تقریباً ۲۰۰ پارکری کوہلی جیتے گئے۔ میرپور خاص اور امرکوٹ کے علاقوں میں

۱۹۶۹ء تک مزید ۲۰۰ کولی بپتسمہ حاصل کر چکے تھے۔

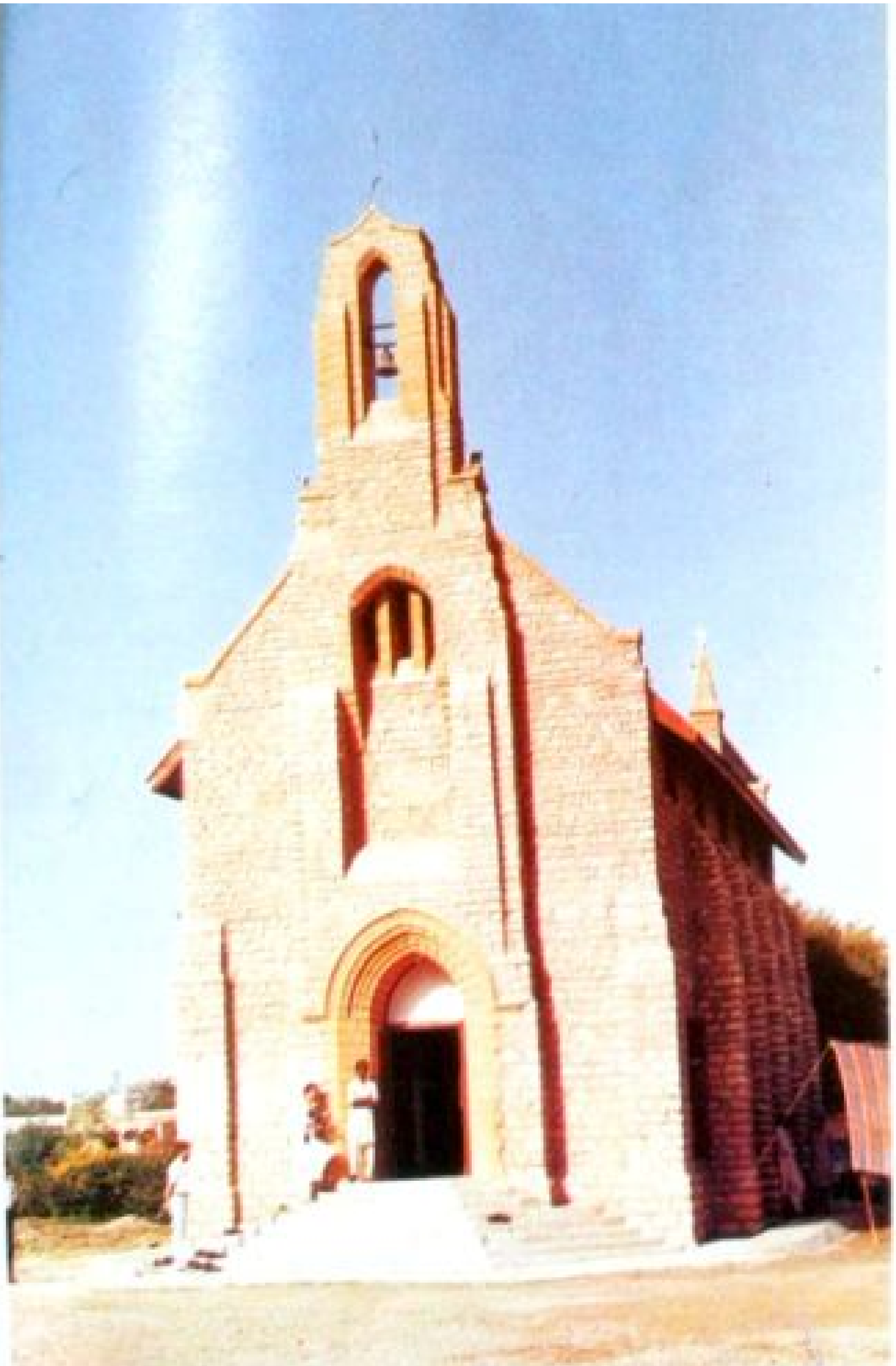
بشپ چندو رے[لے] کے بعد بشپ روڈون (RT REV A RUDVIN) سندھ کے بشپ چنے گئے۔ تو انہوں نے حالات کے پیش نظر ۱۹۷۲ء میں پادری بشیر جیون کو رورل ڈین مقرر کیا۔ بعد میں جب حیدر آباد کے علاقہ کو کراچی سے علیحدہ کر کے نئی ڈایوسیس بنادی گئی تو بشیر جیون ہی کو نئی ڈایوسیس کا بشپ بنایا گیا۔ ان کے دور میں سندھ میں انجیلی کام میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ اُن کی اور ان کے ہمنوا کی محنت شاقہ سے آج ہزاروں کی تعداد میں کولی بھیل مسیحیت کے حلقہ بگوش ہو چکے ہیں۔ ان ہی لوگوں میں سے تربیت دے کر پادری اور مناد صاحبان کو ان علاقوں میں استعمال کیا جارہا ہے۔

رتن آباد نزد میرپور خاص کے قریب قائم کردہ ایک ریکارڈنگ اسٹیشن کے ذریعہ مسیحی پیغام، گیت اور غزلیں ریکارڈ کر کے سندھی لوگوں میں بشارت کے کام کو زیادہ دلچسپ اور بامعنی بنایا جاتا ہے۔ اسی سنٹر سے پادری صاحبان مناد وں اور چرچ مراکز کے لئے مزید پروگرام گاہے گاہے نشر کیے جاتے ہیں۔

میرپور خاص، مٹھی، کیرو، ٹنڈو آدم اور حیدر آباد میں سندھی لوگوں اور غریب بچوں کے لئے سکول اور بورڈنگ ہاؤس تعمیر کیے گئے ہیں۔ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا سے کئی مشنری بالکل نئے جذبہ اور ولولہ کے ساتھ کام میں منہمک ہیں۔

راقم الحروف کو ذاتی طور پر ۱۹۹۲ء میں ان جگہوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کے مشنریوں کی رہائش گاہیں صاف پانی، بجلی اور سوئی گیس جیسی نعمتوں سے محروم ہیں۔ مگر ان کے دلی جذبہ، خداوند کے لئے کام اور ارشادِ اعظم کی تکمیل کے سامنے کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔

لے People Movement in the Punjab. Fred Stock



پاکستان کی سرزمین پر پہلا گرجا جسے انگریزوں نے فتح سندھ کے بعد ۱۸۴۶ء میں ورثی
حیدرآباد سندھ میں تعمیر کیا تھا (اب مرمت شدہ ہے)

کنری (Kunri) کے علاقہ میں ہسپتال قائم ہے۔ لاہور میں جون ۱۹۹۳ء میں کمشنر لاہور کو چرچ فاؤنڈیشن سیمینارز کی تقریب میں بحیثیت مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تو انہوں نے کنری ہسپتال کی خدمت کے بارے میں اپنے تاثرات کا ان الفاظ میں اظہار کیا۔

''سندھ میں تعیناتی کے دوران دفتر کے امور نپٹاتے ہوئے اور دوران مصروفیت مجھے میری اہلیہ کی جانب سے پیغام ملا کہ بچہ بیمار ہے اس لئے جلد گھر پہنچیں۔ چشم زدن میں میں بیوی اور بچہ کو لے کر کنری ہسپتال میں پہنچا۔ یہاں تک ڈاکٹر اور سندھی مسیحی کارکن کو میں نے مثالی خدمت کرتے دیکھا۔ اور مشنری جذبہ کا اظہار نمایاں تھا۔''

ایس۔ آئی۔ ایم

۱۹۲۲ء میں سندھ کے علاقوں میں گھوٹکی، سکھر، شکارپور، خیرپور، لاڑکانہ اور دادو میں پادری ایم۔ ڈبلیو انگیر نے بھی کام شروع کیا۔ اس کام کو پادری ہدایت مسیح اور مس انیتا عمر ANITA UMAR اور ریورنڈ رے بوکر RAY BUKER نے اسی شد و مد سے جاری رکھا۔ انہی لوگوں نے رحیم یار خان جا گرلز کا ہوسٹل قائم کیا۔ پادری ایم ڈبلیو انگیر کا تعلق سوڈان انٹیرئیر مشن سے تھا۔ جسے پی۔ سی۔ ایف (P.C.F) کا نام دیا گیا تھا۔

انگریزی راج کا پہلا گرجا

جب ۱۸۴۳ء میں فاتح سندھ جنرل چارلس نیپیر نے امیران سندھ کو میانی اور دابو MIANI & DABO کے مقام پر شکست دے کر سندھ پر قبضہ کرلیا تو کوٹڑی میں چارلس نیپیر نے اپنے مذہبی جذبات کا ثبوت دیا اور ایک

ایک چرچ تعمیر کروایا جسے موجودہ پاکستان میں انگریزی راج کا پہلا گرجا کہنا مناسب ہے۔ یہ چرچ پاکستان میں سب سے پرانا ہے۔ یہ ایک وسیع کیمپس پر واقع ہے۔ یہ حیدرآباد ڈائیوسیس چرچ آف پاکستان کے زیر انتظام ہے۔ اسے ۱۸۴۶ء میں یعنی تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل تعمیر کیا گیا تھا۔ اور حال ہی میں اس کی مرمت کر کے اس کی خوبصورتی کو بحال کر دیا گیا ہے۔ اس گرجا میں آج سندھ کے نومریدین عبادت کرتے ہیں۔

رومن کیتھولک کلیسیاء

نفاذ اسلام کی تحریک کی بنا پر مسیحیت کی اشاعت میں ایک سنگین رخنہ پیدا ہو گیا ہے اور یہ کام کافی مشکل ہو گیا ہے۔ یہ سندھی لوگ جن کا ابھی تک ذکر ہو رہا تھا ہندوستان میں قحط پڑ جانے کی بنا پر تلاش روزگار میں اندرون سندھ ہجرت کر آئے تھے۔ یہ مہاجرین پانچ لاکھ کی تعداد میں تھے۔ ان کے قبیلے کولی، وھی، پارکری اور بھیل کو بڑے ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وہ ہندو کہلاتے ہیں۔ مگر کبھی کسی اعلیٰ ذات نے انہیں قبول نہیں کیا۔ رومن کیتھولک کلیسیا نے پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے تین چار سال پہلے یہاں بشارتی کام شروع کیا تھا۔ لیکن طویل مدت گزر جانے کے باوجود تا حال کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

۱۸۸۰ء کی دہائی میں چند ایک مشنریوں نے پھر بڑی لگن سے کام شروع کیا اور آج انہی قبائل میں سے رومن کیتھولک کلیسیا نے چرواہی اور روحانی خدمت کے لئے فادر بنانے شروع کر دیے ہیں۔

۱۹۸۶ء میں سب سے پہلے کہانت کے عہدہ پر سرفراز ہونے والا موہن تھا۔ کراچی اور سندھ کے دوسرے حصوں میں لڑکے اور لڑکیوں کو تعلیم دینے کے مواقع پیدا کیے جا رہے ہیں۔ بلکہ بہترین بندوبست کیا جا رہا ہے۔ ٹنڈو الہٰ یار میں

لڑکیوں کی رہائش کی خاطر ایک ہوسٹل تعمیر کیا گیا ہے۔ دوسری جگہوں میں بھی سکول ہوسٹل، اور گرجا گھر تعمیر ہو رہے ہیں۔ فادر اور سسٹر صاحبان ایک نئے بشارتی جذبے کے ساتھ خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اس وقت سندھ میں رومن کیتھولک فرقہ سے تعلق رکھنے والے مسیحیوں کی تعداد تقریباً بیس ہزار ہے۔

سندھی ہندو اپنی پرانی روایات اور رسومات پر سختی سے کاربند ہیں۔ اور دور دور بکھرے ہوئے ہیں۔ مختلف ذاتوں اور قبیلوں میں منقسم ہیں۔ بشارت کا سلسلہ حوصلہ افزاء ہے لیکن اتنا آسان نہیں۔ اسی انجیلی اشاعت اور خدمت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے فریڈرک اور مارگریٹ سٹاک FREDRICK AND MARGARER STOCK یوں رقم طراز ہیں۔

''خداوند نے پاکستان کی کلیسیا کو بشارت کا ایک نیا موقع فراہم کیا ہے۔ اور اندرون سندھ (ہندوؤں میں) ایک نیا علاقہ ہے جہاں اس خدمت کے لئے زمین کافی زرخیز ہے۔''

باب ہشتم

مشنری تحاریک۔ مختلف کلیساؤں کی آمد

جنگِ آزادی اور بعد کے واقعات

پنجاب کی فتح کے ساتھ ہی مشنری تحاریک کی کارروائی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کارواں میں ہراول دستہ کے سپاہیوں کے طور پر بدیسی لوگوں جان نیوٹن، چارلس فورمن، ایڈز ریوگوڈرن، تامس ہنٹر، کلارک اور فینڈر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان سب کی زندگیوں کا تفصیلی حال زیر بحث آ چکا ہے لیکن خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے بعد مشنری تحاریک کیسے چلیں اور پھر کون کون ان میں شامل ہوئے۔ پھر کون سی تحاریک سامنے آئیں اور کیا کیا کارہائے نمایاں ظہور پذیر ہوئے۔ ان پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے سال پر ایک نظر ڈالنا اچھا ہوگا۔

لارڈ ڈلہوزی کے دور کا حال:۔ ۵۶-۱۸۴۸ء تک تمام ہندوستان انگریزی تسلط میں آ چکا تھا۔ اسی وقت میں جرنیلی سڑک اور راستوں کا اجرا ہوا اور ریلوے لائن شروع ہوئی اور سفر کی دشواریاں ختم ہو کر آسانیوں میں تبدیل ہو گئیں۔ مگر پھر بھی مشنری حضرات بڑے کٹھن حالات میں سفر کرتے رہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ آمد و رفت آسان کام نہ تھا۔ بسا اوقات یہ بھی ہوا کہ وہ اپنے خاندانوں کو محفوظ جگہوں پر چھوڑ کر انجیلی بشارت کے لئے طویل سفر پر روانہ ہو جاتے تھے۔ اور یہ سلسلہ اسی عہد میں شروع ہوا تھا لیکن ڈلہوزی نے انگریزی سلطنت کو بہت وسعت دی۔ تاریخ دان صحھ کے الفاظ اس امر کی عکاسی کرتے ہیں

کہ موجودہ ہندوستان ڈلہوزی کا بنایا ہوا ہے۔ لیکن سمجھ کے الفاظ کا دوسرا رخ بھی سامنے آتا ہے کہ ڈلہوزی کی چند پالیسیوں مثلاً ہندو بیواؤں کی دوبارہ شادی، تبدیلی مذہب کی اجازت اور مختلف ریاستوں کے الحاق نے ہندوستانیوں کو بددل کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لارڈ کیننگ کے دور میں ۱۸۵۷ء کا زبردست غدر ہوا جسے جنگ آزادی کہتے ہیں۔ درحقیقت اس کی سیاسی، مذہبی اور فوجی وجوہات تھیں۔ یہ میرٹھ سے شروع ہوا اور جلدی ہی اس نے دہلی، کانپور، لکھنو اور وسط ہند کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سر جان لارنس کے تحت پنجاب نے وفاداری کا دامن نہ چھوڑا اور پنجاب کی افواج نے دہلی کا محاصرہ کر لیا، باغیوں کو شکست دی۔ جنرل نکلسن NICHOLSON کی سرکردگی میں دہلی فتح ہوا۔ اُدھر کانپور، وسط ہند اور لکھنو بھی زیر کر لئے گئے۔ یہ دونوں فاتح تو اس دنیا میں نہ رہے لیکن اپنے لوگوں کو ہندوستان میں مزید نوے سال حکمرانی کرنے کو چھوڑ گئے۔

سکھ، گورکھے، نواب آف جند JIND پٹیالہ اور نواب آف کپورتھلہ انگریزوں کے وفادار رہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ سکھ جن کو صرف آٹھ سال پیشتر پنجاب میں شکست دے کر اُن کی حکومت اور راج انگریزوں نے چھین لیا تھا وہ اس جنگ میں انگریزوں کے بہت وفادار رہے۔ اور فتح میں اُن کا بہت حصہ ہے۔ اگر سکھ اور گورکھے انگریزوں کا ساتھ نہ دیتے تو ہندوستان سے انگریزی راج اور انگریز ہمیشہ کے لئے یوں چلے جاتے جیسے ان کا ہندوستان سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ لیکن جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔

انگریزی راج تو قائم رہا اور ہندوستان اُن کے ہاتھ سے نہ گیا مگر بے شمار انگریز افسر اور سپاہی ان کے ہاتھ سے جاتے رہے۔ دہلی اور میرٹھ میں تو بلوائیوں نے بہت زیادہ انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دوسری جگہوں میں

بھی انگریز اور بدیسی مشنری ان فسادات کی نذر ہو گئے۔ ٹامس ہنٹر اور اس کا خاندان اُن میں سے ایک تھا۔

ہندوستانی مسیحیوں کو اس سے بھی زیادہ مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ خدا کے سوا اُن کا پُرسان حال کوئی نہ تھا۔ جانیں الگ گئیں اور نقل مکانی بھی کرنی پڑی۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے نتیجہ میں ہندوستانی حکومت کمپنی کے تسلط سے نکل کر براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت ہو گئی۔ لارڈ کیننگ کو ۱۸۵۸ء میں پہلا وائسرائے بنایا گیا۔

ملکہ وکٹوریہ نے جو اعلان کیا اس میں سے دو باتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے

۱۔ رعایا کو مذہبی آزادی کا یقین دلایا گیا۔

۲۔ کسی کو زبردستی مسیحی نہیں کیا جائے گا۔

انگریزی دور میں کچھ فیصلے، پالیسیاں اور حکم نامے اس قسم کے وضع کئے گئے جو غالباً کلیسیا کی معاونت نہ کر سکتے تھے۔ لیکن ان میں عوامی فلاح و بہبود کی جھلک کافی نمایاں تھی۔ سماجی طور پر یہی فیصلے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لئے سماجی گہوارے ثابت ہوئے۔ ان کا مختصر ذکر ہی کافی ہے۔ کیونکہ واقفیت عامہ کے ناطے آج کے انسان کے لئے یہ باتیں بڑی مفید ہوں گی۔ اور کسی نہ کسی طرح اُن کا عمل میں آنا کلیسیا کے تعلق کو ضرور ظاہر کرتا ہے۔

چند ایک گورنر جنرل، وائسرائے اور انگریز افسر خداوند سے پیار کرنے والے تھے۔ اُن کی بدولت کلیسیا نے اس خطہ میں ترقی کی بلکہ بشارتی کام کے لئے راستے ہموار ہوئے۔ چند ایک کے نام اور کام مختصر بیان کئے گئے ہیں۔

۱۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد آنے والوں میں پہلے نمبر پر سرجان لارنس

تھے جنہوں نے مشنری تحریک والوں کا بڑا ساتھ دیا۔ یہ پنجاب کے پہلے چیف کمشنر تھے۔ پادری نیوٹن اور فورمن کے دلی دوست تھے۔ ان ہی کے نام پر لاہور میں لارنس روڈ ہے۔ جو ریگل چوک سے شروع ہوتی ہے اور چڑیا گھر کے عقب سے گزر کر آگے نکل جاتی ہے۔ وہ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۶۹ء تک ہندوستان کے وائسرائے رہے۔ پنجاب کو فتح کرنے اور غدر کو فرو کرنے میں ان کا زبردست ہاتھ تھا۔

۲- لارڈ میو MAYO ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۲ء تک وائسرائے کے عہدہ پر متمکن رہے۔ اس کی خوش خلقی اور مہربانی کی چاردانگ عالم میں دھوم رہی۔ اور وہ بہت ہر دلعزیز تھے۔

اسی زمانہ میں مال روڈ پر واقع لاہور کا مشہور ایچی سن کالج قائم ہوا اور بدستور قائم ہے۔ اور تعلیمی میدان میں اس کی خاص حیثیت کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ بہت سے معروف سیاستدان اسی کالج سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳- ۱۸۷۷ء میں لارڈلٹن نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ ۱۹۲۰ء میں اسے مسلم یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوگیا۔ پاکستان کے قیام میں اس یونیورسٹی نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

۴- لارڈ رپن کا زمانہ ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک کا تھا۔ رپن بڑا ہمدرد، نیک، آزاد خیال اور مدبر تھا۔ جس کی بدولت اسے سیاسی ولی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ (POLITICAL SAINT OF INDIA)۔ اس عہد کا مشہور واقعہ ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل کمیٹیوں کی تشکیل ہے۔ اس سے بڑھ کر پنجاب یونیورسٹی کا قیام ہے جو ۱۸۸۱ء میں مال روڈ پر قائم ہوئی۔ یہ ایک بڑا کارنامہ تھا۔

لارڈ رپن نے سارے وائسرائیوں سے زیادہ ہر دلعزیزی حاصل کی۔ ۱۸۸۴ء میں جب وہ عازم انگلستان ہوا تو لوگوں نے جس خلوص سے دہلی سے بمبئی

تنگ راستوں پر دو اطراف میں کھڑے ہو کر پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں یہ اس کے
لئے خیر خواہی کا بین ثبوت تھا۔ یوں یہ وائسرائے اپنے وطن واپس لوٹا کہ ایسا نظارہ
پھر کبھی دیکھنے میں نہ آیا۔

۵۔ لارڈ ڈفرن ۱۸۸۴ء تا ۱۸۸۸ء کے عہد میں انڈین کانگریس
۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی جو سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی۔ اس میں ملک بھر کی
قومیں شامل تھیں۔ اے۔ آر ہیوم A.R. HUME چند ہندوستانی انگریزوں
کے ہمراہ اس کی بنیاد رکھنے والوں میں سے تھے۔ اسی لارڈ کے نام پر کوئٹہ میں
لیڈی ڈفرن ہسپتال قائم کیا گیا۔ اسی جماعت نے سبھاش بوس SUBHASH
BOSE گاندھی، جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل اور محمد علی جناح جیسے لیڈر پیدا کئے
جن کی محنت یوں رنگ لائی کہ بھارت اور پاکستان معرض وجود میں آئے۔

۶۔ لارڈ کرزن کے عہد ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۵ء میں محکمہ آثار قدیمہ کا قیام عمل
میں آیا۔ اس محکمہ کو ذمہ داری سونپی گئی کہ قدیم عمارات کی حفاظت کرے۔ اس
ضمن میں پرانے شہر کھودے گئے۔ ان ہی دنوں ٹیکسلا دریافت ہوا۔ ٹیکسلا کر اس سر
کاپ کے مقام پر ایک ہل چلاتے شخص کو ملی تھی۔

۷۔ لارڈ کرزن کے عہد میں ۱۹۰۱ء دریائے سندھ کے مغربی کنارے
کے بہت سے علاقہ کو پنجاب سے علیحدہ کر کے شمال مغربی سرحدی صوبہ بنا دیا گیا۔

۸۔ مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں عمل میں آیا۔ یہ جماعت آج بھی
پاکستان کی ایک بڑی سیاسی جماعت ہے۔

۹۔ ۱۹۳۵ء میں سندھ کا صوبہ لارڈ ولنگڈن کے عہد میں قیام پذیر ہوا۔ یہ
وہی لارڈ ہے جس کی بیوی کے نام پر لیڈی ولنگڈن ہسپتال قائم ہے۔ اسی سال کوئٹہ
میں ایک زبردست زلزلہ آیا جس نے کوئٹہ کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا۔ جسے دوسرا انگلینڈ

کہا جاتا تھا وہ اپنی خوبصورتی سے محروم ہو گیا۔ ہزار ہا انسان موت کے منہ میں چلے گئے۔ کوئیٹہ مشن ہسپتال کے ڈاکٹر Henry Holland ہنری ہالینڈ نے تقریباً پچاس ہزار لوگوں کی آنکھوں کا علاج کیا جو اس زلزلہ میں اپنی بصارت کھو بیٹھے تھے۔ اور خداوند کے فضل سے ان کی بصارت لوٹ آئی۔

تقسیم ہند

تین جون ۱۹۴۷ء کو اعلان ہوا کہ ملک کے دو حصے کر دیئے جائیں گے۔ یوں ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دنیا کے نقشہ پر ابھرا۔ کراچی دارالحکومت مقرر ہوا۔ ان حقائق کو قلمبند کرنا اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے تاکہ کلیسیائی تواریخ کا مطالعہ کرتے وقت چند ایک باتوں کو سمجھنے اور ذہن نشین کر لینے میں آسانی ہو۔ مثال کے طور پر ۱۸۴۹ء میں جب پنجاب فتح ہوا اس وقت صوبہ سرحد اور صوبہ سندھ کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ علاقہ سارے کا سارا ایک ہی گورنر کے ماتحت ہوا کرتا تھا۔ صوبہ سرحد کا ۱۹۰۱ء میں اور صوبہ سندھ کا قیام ۱۹۳۵ء میں عمل میں آیا۔

بیسویں صدی سے پہلے پشاور اور سندھ میں چیف کمشنر ہوا کرتے تھے۔ جو ان علاقوں کا انتظام سنبھالتے اور مرکزی حکومت کے مقرر کردہ ہوتے تھے۔

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ سلاطین دہلی کے وقت میں دارالحکومت دہلی تھا۔ اور اورنگ زیب کی وفات تک اسے یہ اہمیت حاصل رہی۔ حالانکہ تھوڑے عرصے کے لئے اکبر اور جہانگیر نے فتح پور سیکری، آگرہ اور لاہور کو بھی پایہ تخت بنائے رکھا۔ مگر انگریزوں نے کلکتہ کو دارالسلطنت بنائے رکھا۔ ۱۹۱۱ء میں دہلی کو اپنی پرانی حیثیت حاصل ہو گئی۔

انگریزوں کی آمد پر ۱۸۴۹ء میں پنجاب کی فتح کے بعد

پشاور، مری، راولپنڈی اور کوئٹہ جیسے شہروں میں چھاؤنی یا ملٹری اسٹیشن قائم ہوئے تو وہاں چیپلن بھی مقرر کر دیے گئے۔

اسی طرح پشاور	۱۸۴۹ء
راولپنڈی	۱۸۵۳ء
مری	۱۸۵۷ء
نوشہرہ	۱۸۷۲ء
اور کوئٹہ	۱۸۷۰ء

میں گرجا گھر بھی تعمیر کیے گئے تا کہ انگریزوں اور مسیحیوں کی رُوحانی تشنگی کو پُورا کیا جا سکے۔ تعلیم کو عام کرنے کے لئے جیسز اینڈ میری سسٹرز بھی تشریف لے آئیں جس سے کام خوب چل نکلا۔

۱۸۵۶ء میں رومن کیتھولک کلیسیا کا پہلا سکول سیالکوٹ میں دوسرا سکول ۱۸۶۱ء میں سینٹ پیٹرک کراچی میں قائم ہوا اور اس طرح تعلیمی کام شروع کر دیا گیا۔ ان ایام میں مسیحیوں کی آبادی، مدراسی، گوانی، اینگلو انڈین، انگریز اور آئرش لوگوں پر مشتمل تھی۔ پنجابی لوگ تھے تو سہی مگر بہت کم تعداد میں تھے۔

یکم ستمبر ۱۸۸۶ء میں پاپائے اعظم نے محسوس کیا کہ لاہور کو علیحدہ اسقفی حلقہ قرار دیا جائے۔ پس لاہور کو آگرہ سے علیحدہ کر دیا گیا اور اسے لاہور ڈایوسیس کا نام دیا گیا۔ اس کے دائرہ اختیار میں پورا پنجاب، پشاور، کشمیر اور بہاولپور شامل تھے۔

انارکلی کا مقبرہ[1] ۱۸۴۹ء میں (پنجاب میں انگریزی راج میں) لاہور کا پہلا گرجا مقرر ہوا۔ انارکلی مغلیہ دربار کی خوبصورت کنیز تھی اور شہزادہ سلیم اُس کی

---

1. (Anarkali's Tomb, Lahore, Record of the Punjab Secretariate, Evergreen Press-1973)



رومن کیتھولک کا پہلا گرجا (انار کلی لاہور) جو ۱۸۶۱ء میں تعمیر ہوا۔ سینٹ فرانسس
چرچ انار کلی، لاہور

زلفوں کا اسیر تھا۔ راز افشا ہو جانے پر اکبر بادشاہ کے حکم سے ۱۵۹۹ء میں لاہور میں انارکلی کو دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا۔ اس کا اصل نام شرف النسا تھا۔ پنجاب کی فتح پر انار[illegible] کی قبر کو درمیان سے ہٹا کر مقبرہ کے بازو میں کر دیا گیا اور اسی مقبرہ کو سینٹ جیمز چرچ کا نام دیا گیا۔

یہی مقبرہ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۸۸ء تک مسیحی عبادتوں کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ رومن کیتھولک کلیسیا نے پہلا آر۔ سی چرچ اس سرزمین میں انارکلی میں تعمیر کیا تھا۔

رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیسیائیں

پنجاب کی فتح سے قبل کسی پروٹسٹنٹ کلیسیا کا وجود پاکستانی خطہ میں کہیں نہ تھا۔ یہ کلیسیا ۱۸۵۰ء میں سرزمین پنجاب میں قائم ہوئی۔ اب یہ لازم ہے کہ اس باب میں تمام کلیسیاؤں کی خدمت اور آمد پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ رومن کیتھولک کلیسیا پاکستان کی سب سے بڑی بلکہ دنیا بھر میں سب سے بڑی اور قدیم اور فعال تنظیم ہے۔ یہی ہے جس کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ یہ دو ہزار سال پرانی کلیسیا ہے۔ دنیا کی کوئی تنظیم یا سلطنت اس قدر طویل عرصے پر محیط نہیں رہ سکی۔ ہر ایک زوال پذیر ہوتی رہی، بکھرتی رہی جسے کوئی یکجا نہ کر سکا نہ سنبھال سکا۔ مگر کیتھولک فرقہ آج تک رو بہ ترقی ہے۔ اس کلیسیا کا پوپ (پاپائے اعظم) روم میں سکونت پذیر ہے۔ اس کی اپنی ریاست Vetican ہے جہاں اس کا اپنا سکہ چلتا ہے۔ دنیا کا کوئی خطہ، کوئی حصہ اس کلیسیا کے وجود سے خالی نہیں۔ تمام دنیا میں اس کلیسیا سے منسلک لوگ اس روحانی پیشوا کو عزت و تکریم دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ بہت مناسب ہے کہ اسی کلیسیا کا جو سب کلیسیاؤں کی ماں ہے پہلے ذکر کیا جائے۔

رومن کیتھولک

مغلیہ سلطنت کے دور میں مسیحیت کا جائزہ یہ ہے۔ اکبر اعظم مختلف مذاہب میں دلچسپی رکھتا تھا۔ فادر صاحبان اکثر اس کے پاس آتے جاتے تھے۔ اور انہوں نے اکبر اعظم کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ مسیحیت اختیار کرلے لیکن یہ ممکن نہ ہوا۔

اکبری دربار میں فادر جل پریرا JAL PEREIRA کلکتہ سے لاہور تشریف لانے والا پہلا شخص تھا۔ اس کی آمد نے دوسرے مسیحی رہنماؤں کے لیے دروازے کھول دیے۔ وہ دربار میں مسیحیت کی اشاعت کرتے اور مسیحی تصاویر کی نمائش کرتے تھے۔ اکبر اعظم اور شہزادہ سلیم ان تصاویر میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔

مغلیہ دور میں ۱۵۹۷ء میں لاہور میں پہلا گرجا تعمیر ہوا۔ یہ محل کے بہت قریب واقع تھا۔ غیر مسیحی اس گرجا گھر کو دیکھتے اور خوشی کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اس کے اندر سازندے اور موسیقار جو گوائی تھے لوگوں کو بہت مرغوب تھے۔ اس کی بدولت لاہور شہر میں ۱۹۱۴ء میں مسیحیوں کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہو گئی تھی۔

جہانگیری دور میں چونکہ مسیحیوں نے پرتگیزوں سے راہ و رسم بڑھا رکھی تھی اس لئے جہانگیر ان سے ناراض ہو گیا تو حالات بہت کشیدہ ہو گئے۔ گرجا گھر کو مقفل کر دیا گیا۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے دور میں مسیحیوں کو ایذا رسانی سے گزرنا پڑا۔ اس سے گھبرا کر مسیحی جو لاہور اور ٹھٹھہ میں آباد تھے نقل مکانی پر مجبور ہو گئے۔ اور اس خطہ میں مسیحیت کا صرف تھوڑا سا بقیہ رہ گیا۔

لاہور کا موجودہ بشپ ہاؤس ۱۸۹۸ء میں تعمیر ہوا اور موجودہ کیتھیڈرل ۱۹۰۷ء میں بنا۔ (دونوں لارنس روڈ نزد ریگل چوک پر واقع ہیں)۔

لاہور کا پہلا آر۔سی بشپ صفورین مو آرڈ تھا۔ لاہور پروٹسٹنٹ ڈایوسیس

۱۸۸۶ء میں وجود میں آئی۔ آج کل ملتان، راولپنڈی، پشاور، کراچی، حیدرآباد اور فیصل آباد کو ڈایوسیس کا درجہ حاصل ہے۔

رومن کیتھولک چرچ نے بھی پہلے پہل بشارت کا کام پروٹسٹنٹ کلیسیا کی طرح ۱۸۸۹ء میں سیالکوٹ اور لاہور ہی سے شروع کیا تھا۔ آزھا، سیالکوٹ سب سے پہلا مرکز قائم ہوا۔ پہلے نومرید چمار اور کمترین لوگ تھے۔ ان لوگوں کی آبادکاری اور سماجی بہبود کی خاطر ۱۸۹۳ء میں مریم آباد میں چھ سو ایکڑ زمین خریدی گئی اور مسیحیوں کو آباد کیا گیا۔ بعدازں ۱۹۰۰ء میں خوش پور اور پھر فرانسس آباد بسائے گئے۔

حال ہی میں سندھ میں شیڈول کاسٹ میں بھی آر۔سی کلیسیا نے بہت کام کیا ہے۔ اور میرپورخاص، نواب شاہ، سانگھڑ اور قاملی، ٹنڈو الہٰ یار میں کلیسیائیں قائم کی گئی ہیں۔ آج ان کی تعداد میں ۲۰ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ یہ ذکر بالتفصیل آچکا ہے۔

پاکستان کی کل مسیحی آبادی کا ۵۶% حصہ صرف پنجاب میں رہائش پذیر ہے۔ اسی صوبہ میں اکثریت آباد ہے۔ یہ لوگ ہندوؤں سے مسیحیت میں آئے ہیں۔ اور یہ اس سرزمین کے قدیم باشندے ہیں۔ مسیحیت کا زیادہ اور سب سے زیادہ کام سیالکوٹ کے علاقوں میں دونوں فرقوں نے شروع کیا۔ سیالکوٹ کا علاقہ مردم خیزی کے لئے مشہور ہے۔

رومن کیتھولک کلیسیا وہ واحد کلیسیا ہے جس کا کام ہر شہر اور دیہات میں پھیلتا جارہا ہے۔ وجہ سرمایہ اور جذبہ ہے۔ آر۔سی چرچ کی یہ بھی خصوصیت رہی ہے کہ وہ کمترین لوگوں میں بہت زیادہ کام کر رہے ہیں۔ اُن کے فادر، مناد اور سسٹرز ہمہ تن مصروف ہیں کہ ہر جگہ روح کے بھوکے اور پیاسے لوگوں کو خوراک اور

عامہ کے ادارے، سٹوڈیوز، خواتین تنظیمیں، ادارہ حقوق انسانی پاکستان، ادارہ امن وانصاف اور ہسپتال قائم ہیں جو بلا امتیاز مذہب وملت پاکستان میں ہمہ تن مصروف خدمت ہیں۔

کیتھولک جرائد میں سب سے مشہور جریدہ کاتھولک نقیب ہے جو ۱۹۲۹ء سے یعنی ۶۵ سالوں سے جاری ہے اور اس کی اشاعت دو ہزار ہے۔ یہ ایک بہت ہی معیاری، مسیحی، سماجی، تعلیمی اور معلوماتی موثر اور اہم رسالہ ہے۔ کاتھولک کلیسیا کا ایک اور کارنامہ کوڑھیوں کے لئے کراچی اور دیگر شہروں میں ہسپتال قائم کرنا ہے۔ محتاط اندازہ کے مطابق چھ ہزار مریضوں کا جو تمام کے تمام مسلمان ہیں ہر ماہ معائنہ اور علاج کیا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی خدمت ہے جس میں یہ کلیسیا غالباً حکومت پر بھی سبقت لے گئی ہے۔

کرائسٹ دی کنگ سمنری کراچی ۱۹۵۹ء میں قائم ہوئی اور یہ فخر کا باعث ہے کہ نصف سے زیادہ فادر صاحبان اسی سمنری سے تربیت یافتہ ہیں اور ان میں سے دو بشپ بھی بن چکے ہیں۔ (جان جوزف اور پطرس)

۱۶ فروری ۱۹۸۱ء پاکستان کے تمام مسیحیوں کے لئے پوپ جان پال دوم کی کراچی میں آمد نے اس دن کو مبارک بنا دیا۔ ان کے استقبال کے لئے اسی (۸۰) ہزار مسیحیوں کا ایک سیلاب امڈ آیا۔ ایک غیر مسیحی نے پوپ کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہا۔ مگر خداوند کا فضل ہی اپنے بندہ کے لئے کافی تھا۔ آپ نے مسیحی فراخدلی کا مظاہرہ کیا اور مسیحی مذہب کی شناخت یعنی معافی سب کے سامنے رکھ دی۔

اس آمد پر پوپ موصوف نے جو الفاظ تاثر کے طور پر مسیحی کلیسیا کے لئے کہے وہ ایمان افزا ہیں۔

"پاکستان کی کلیسیا ایک جوان کلیسیا ہے۔"

کیونکہ پوپ کے دیدار کے لئے آنے والے لوگوں کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل تھی۔

راقم الحروف کی نظر میں کیتھولک کلیسیا دن بدن پاکستانی کلیسیا بنتی جا رہی ہے۔ اس کا خاصا یہ ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ پاکستانی مسیحیوں پر انحصار کر رہی ہے۔ اپنے ذرائع تلاش کر رہی ہے۔

پروٹسٹنٹ کلیسیا کے ساتھ مل کر قومی مسائل اور مصائب میں تعاون کی وجہ سے بڑی پیش رفت ہوئی ہے۔ اس کی اشد ضرورت تھی۔ اور اس ملاپ کی حقیقت کو حالیہ مسائل کی روشنی میں دونوں فرقوں نے اب سمجھا ہے کہ متحد ہو جانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ:۔

ع ان کی داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں

دونوں کو ماضی کی غلطیوں سے سیکھنے اور ایک ہی سمت چلنے کی ضرورت ہے۔ ایسے رہنما اور قیادت پیدا کریں جن کی باتیں اور سیاست محض ڈرائنگ روم تک ہی نہ ہو۔ بلکہ وہ خدمت کے جذبہ سے سرشار ہوں۔ قربانی کے عنصر کو پیش نظر رکھیں۔ کیونکہ یہ عنصر منزل کی یافت میں ہمیشہ مدد و معاون رہا ہے۔

بدیسی سسٹرز اور فادرز کے رواج کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ جدائی اور فرقہ واریت کی ہر دیوار کو زمین بوس کرتا ہے۔ یہ صرف ایک کلیسیا کا شیوہ نہ ہو بلکہ ہر مشن کو یہ طرز عمل اپنانا ہے کیونکہ

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

خدا کرے کہ وہ وقت جلد آئے جب ایک ہی گلہ اور ایک ہی گڈریا ہو۔ ہماری پہچان رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ نہ ہو بلکہ ملک میں ہم صرف مسیحی نام سے

سے پہچانے جائیں۔
رومن کیتھولک کلیسیا بڑی سرعت سے اس خطہ ارض میں رو بہ ترقی ہے۔
بلاشبہ یہ کلیسیا تعداد کے لحاظ سے سب سے بڑی کلیسیا ہے اور سارے ملک
میں پھیلی ہوئی ہے۔

پروٹسٹنٹ کلیسیائیں

پریسبٹیرین چرچ آف پاکستان

پریسبٹیرین چرچ آف پاکستان دو کلیسیاؤں کا اتحاد ہے۔ اس کا سبب
چند ایک باتوں کا مشترک ہونا ہے۔
دونوں پریسبٹیرین کلیسیائیں ہیں
اس سرزمین کی قدیم کلیسیائیں ہیں۔
دونوں ۱۸۵۰ء کی دہائی میں پنجاب میں وارد ہوئیں۔
بشارت کے میدان میں اولین کلیسیائیں ہیں۔
دونوں نے غریب عوام میں انجیل کو پھیلایا اور اس پیغام کو ہر ایک چیز
سے زیادہ ترجیح دی۔
دونوں کے مشنری یو۔ ایس۔ اے سے آئے۔
دونوں جمہوری طرز کی کلیسیائیں ہیں۔
ایک کا نام امریکن پریسبٹیرین چرچ تھا۔ اور دوسری کا نام یونائیٹڈ
پریسبٹیرین چرچ۔
(امریکن پریسبٹیرین بعد میں لاہور چرچ کونسل کے نام سے بھی جانی
گئی)۔

ان دونوں کے ابتدائی مشنری کام کی بابت باب ششم میں تفصیل کے ساتھ ذکر آیا ہے۔ اس لئے یہاں اختصار کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

امریکن پریسبٹیرین چرچ (اے۔ پی)

امریکن پریسبٹیرین چرچ کا ایک مشنری جان لوری لدھیانہ میں مقیم تھا۔ ۱۸۳۵ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے اُسے دعوت دی کہ لاہور آ کر شاہی خاندان کے سکھ بچوں کو تعلیم دے۔ لیکن جان لوری مشنری ہونے کے ناطے بضد تھے کہ وہ مسیحی تعلیم بھی ضرور دیں گے۔ یہ شرط مہاراجے کو اچھی نہ لگی۔ اور جان لوری واپس چلے گئے۔ پنجاب کی فتح کے ایک ہی سال بعد امریکن پریسبٹیرین چرچ (اے۔ پی) کا پہلا مشنری جان نیوٹن لاہور آیا۔ ان کے ہمراہ چارلس ولیم فورمن بھی تھے۔ دونوں شاہی محلے میں رہائش پذیر ہو گئے۔ نیوٹن کو خرابیٔ صحت کی وجہ سے وطن لوٹنا پڑا۔ لیکن فورمن عرصہ دراز تک یہاں پر خدمت کرتے رہے۔

نیوٹن اور فورمن نے شروع ہی میں ایک سکول کھولا اور پھر ۱۸۵۲ء میں باقاعدہ رنگ محل کی زمین خرید کر اس کو وہاں منتقل کر دیا گیا۔

دونوں کا نظریہ تھا کہ انجیل کی بشارت تعلیم اور پیغام کے ذریعہ دینی چاہئے۔ فورمن جب اکیلے تھے تو انہوں نے گوجرانوالہ اور راولپنڈی میں تعلیم کے میدان میں پیش قدمی کی۔ یہ فورمن کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۵۶ء میں راجا بازار میں سکول کھولا گیا تھا۔ اس وقت پادری جان۔ ایچ مارٹن اے۔ پی مشن کی طرف سے راولپنڈی اسٹیشن کے انچارج تھے (بعد میں یہ سکول یو۔ پی مشن کے زیر انتظام دے دیا گیا)۔ فورمن پچالیس سال تک لاہور میں مصروف خدمت رہے۔ انہوں نے امریکن پریسبٹیرین چرچ کی خدمت کو قصور، شاہدرہ، اور شرقپور تک بڑھایا۔ قصور میں بشارتی کام ۱۸۸۳ء میں شروع کیا گیا۔

Scanned by CamScanner

فورمن نے ۱۸۹۴ء میں کسولی کے مقام پر وفات پائی اور انہیں لاہور میں سپردِ خاک کیا گیا۔

امریکن پریسبٹیرین چرچ کے ادارے رنگ محل ہائی سکول ۱۸۵۲ء میں، ایف۔ سی کالج ۱۸۶۴ء میں اور کنیئرڈ ہائی سکول قائم ہوئے۔ اور کنیئرڈ کالج ۱۹۱۳ء میں۔ یہ تمام ادارے قومیا لئے گئے ہیں۔ یہ پاکستانی کلیسیا کا بہت بڑا المیہ ہے۔ اس چرچ کے تین ادارے رنگ محل مشن ہائی سکول، ایف۔ سی کالج اور کنیئرڈ ہائی سکول پنجاب یونیورسٹی سے بھی پرانے ہیں جو ۱۸۸۱ء میں قائم کی گئی تھی۔

یو۔ سی۔ ایچ ہسپتال ۱۹۴۷ء میں ایف۔ سی کالج ہی میں شروع کیا گیا تھا۔ ان ایام میں نولکھا چرچ تعمیر ہوا جس کا سنگِ بنیاد ۱۸۵۳ء میں رکھا گیا تھا۔ یہ واحد چرچ ہے جو ابھی تک اس کلیسیا کی تاریخ کی یاد بنا آج بھی قائم ہے۔ اس چرچ میں پادری طالب الدین، پادری ایچ ریوٹھاکرداس اور پھر ایڈگر خاں نے مثالی خدمت کی۔

یہ کلیسیا ۲۰ رنومبر ۱۹۹۲ء سے پریسبٹیرین چرچ آف پاکستان میں مدغم ہو چکی ہے۔

یونائیٹڈ پریسبٹیرین چرچ (یو۔ پی) پاکستان

یو۔ پی کلیسیا کا بانی مشنری ایںڈریو گارڈن اپنی بیوی ربقہ اور چھوٹی بہن الزبتھ گارڈن کو لے کر ۱۳ رفروری ۱۸۵۵ء کو کلکتہ پہنچا۔ پھر اسی سال سیالکوٹ پہنچ گیا۔ ۱۸۵۶ء میں پادری افرائیم اور پادری اوپل بھی سیالکوٹ آ گئے اور سیالکوٹ مشن کا کام شروع ہوا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد لدھیانہ کے دو یتیم بھائی الیشع سوفٹ اور جارج سکاٹ بھی اُن سے آ ملے۔ وہ بعد میں ۱۸۵۹ء میں پاسبان کی خدمت پر تعینات کئے گئے۔

۱۸۶۱ء میں سیالکوٹ مشن خودمختار سنڈ بنادی گئی۔ اس کلیسیا نے ظفروال

سیالکوٹ، نارووال، پسرور اور گوجرانوالہ میں خدمت کا آغاز کر دیا۔ اور

ہزاروں کی تعداد میں میگھ اور کمترین لوگوں کو خداوند کے قدموں میں لے آئے۔

چند ہی سالوں کے اندر اندر راولپنڈی، سرگودھا، شیخوپورہ اور فیصل آباد میں بھی

مسیحیت نے قدم جمالئے۔

یو۔ پی چرچ کا پہلا نومرید ہندو رام بھجن ۲۵ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کی جنگ

آزادی میں مسیحی ہوا۔ یہ اینڈریو گورڈن کی وساطت سے مسیحی ہوا تھا۔ دوسرا ونہ

مرالی کے نزدیک شہابدکیے کا رہنے والا تھا۔ جو کمترین لوگوں میں سے پہلا پھل تھا۔

جس نے ۱۸۷۳ء میں خداوند کو اپنا نجات دہندہ قبول کر لیا۔

۱۹۰۴ء میں سیالکوٹ کنونشن بیداری کی میٹنگ کی صورت میں شروع

ہوئی۔ اور اس کے سبب کلیسیائیں زبردست بیداری کی لپیٹ میں آ گئیں۔ خداوند

کا کام دن بدن ترقی پر تھا۔ سب سے زیادہ اور پہلے بشارت کا کام یو۔ پی سی نے

شروع کیا تھا۔

دینی تعلیم۔ تعلیم اور طب کے میدان میں بڑے نامور ادارے قائم کئے۔

جس میں کرسچن ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ۱۸۸۸ء میں، گارڈن کالج ۱۸۹۳ء میں،

تھیولاجیکل سیمنری ۱۸۷۷ء میں قائم ہوئی۔ میموریل ہسپتال سیالکوٹ ۱۸۸۶ء

میں، کرسچن ہسپتال ٹیکسلا ۱۹۲۲ء میں اور یو۔ پی چرچ کا مشہور گاؤں مارٹن پور

۱۸۹۸ء میں سموئیل مارٹن نے آباد کیا تھا۔ سیالکوٹ میں حاجی پورہ کا سکول برائے

طالبات بڑا مشہور ہے۔

سی۔ ٹی۔ آئی سکول خدمت کے میدان میں سب مسیحی سکولوں میں نامور

رہا ہے۔ کیونکہ یہاں پر سیالکوٹ، نارووال، گوجرانوالہ کے علاقوں سے بچوں کو لا



سی ٹی آئی بارہ پتھر سیالکوٹ جو ۱۸۸۸ء میں تعمیر ہوا۔ اس نے مسیحی قوم کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔

کر انہیں تعلیم سے آراستہ پیراستہ کیا جاتا تھا۔ کھیلوں کے میدان میں بھی اس سکول کا کوئی ثانی نہ تھا خاص کر اتھلیٹکس اور باسکٹ بال تو اس ادارہ کی نمایاں پہچان تھے۔ ماسٹر جیون مل سی۔ ٹی۔ آئی کے پہلے ہیڈ ماسٹر تھے۔

اس کلیسیا نے جید عالم، پاسبان، ماہر تعلیم، کھلاڑی اور ڈاکٹر پیدا کئے۔ لیکن ۱۹۶۸ء میں یہ کلیسیا دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ ڈاکٹر کے۔ ایل ناصر کی قیادت میں مسٹر کارل میکنائر کی تنظیم آئی۔ سی۔ سی میں چلا گیا اور دوسرا یونائیٹڈ پریسبٹیرین چرچ پروگرام ایجنسی کے تحت رہا۔

یہ تقسیم یو۔ پی چرچ کا ایک بہت بڑا سانحہ ہے کیونکہ ڈاکٹر کے۔ ایل ناصر ایک زبردست مبلغ، علم الٰہیات کے عالم اور واعظ ہیں۔ ان کے الگ ہونے سے پاکستان کی کلیسا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

۱۹۷۲ء میں بھٹو حکومت نے یو۔ پی کلیسیا کے بیشتر تعلیمی ادارے قومیا لئے۔ ۱۹۹۲ء میں نولکھا چرچ لاہور میں امریکن پریسبٹیرین اور یونائیٹڈ پریسبٹیرین یعنی لاہور چرچ کونسل اور یو۔ پی۔ چرچ دونوں اتحاد میں شامل ہو گئے۔ اور آج یہ پریسبٹیرین چرچ آف پاکستان کہلاتا ہے۔

چرچ آف سکاٹ لینڈ (سیالکوٹ چرچ کونسل)

اس کلیسیا کے پہلے مشنری تھامس ہنٹر تھے۔ جو اٹھائیس برس کی عمر میں اکتوبر ۱۸۵۶ء میں دریائے سندھ کے راستہ گجرات سے ہوتے ہوئے سیالکوٹ پہنچے تو اپنے ساتھ ایک نو مرید محمد اسماعیل کو بھی لائے تھے۔ ہنٹر صاحب، اس کی اہلیہ اور شیر خوار بچہ کو ۹ رجولائی ۱۸۵۷ء کو سیالکوٹ میں شہید کر دیا گیا۔ ان کی زندگی اور شہادت کی بابت ذکر تفصیلاً لکھا جا چکا ہے۔ ہنٹر صاحب وہ خوش قسمت انسان تھے جنہیں پاک و ہند کلیسیا کا پہلا شہید کہا جاتا ہے۔ اسی شہید کی یاد میں ۱۸۶۱ء میں ہنٹر

میموریل چرچ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔

وہ اپنے خاندان کے ہمراہ چھاؤنی میں ہولی ٹرنٹی چرچ میں ہلاک ہوئے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد ۱۸۶۱ء میں پادری جان ٹیلر چرچ آف سکاٹ لینڈ کے دوسرے مشنری کے طور پر سیالکوٹ میں آئے۔ تیسرا اہم مشنری ولیم ہیرن تھا جو ۱۸۸۵ء میں آیا اور سیالکوٹ کنونشن کے شروع کرنے میں جان ہائیڈ اور جان ٹیلر کے ساتھ شریک رہا۔ ان دونوں مشنری صاحبان نے پادری [illegible] اسماعیل کے ساتھ مل کر سیالکوٹ، نارووال کے دیہاتوں میں اور گجرات اور وزیر آباد کے گردونواح میں خوب بشارت کا کام کیا۔ گجرات میں پادری [illegible] نے خداوند کی بہت خدمت کی۔ اس کا نام آج بھی کلیسیاؤں میں بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ اسی کلیسیا نے انجیلی بشارت کو جموں اور کشمیر میں پہنچایا۔

۱۹۰۵ء تک اس کلیسیا کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ یو۔ پی چرچ کی طرح اس کلیسیا نے اولاً پسماندہ لوگوں میں بشارت دی۔ تعلیمی کام کے سلسلہ میں ایک سکول سیالکوٹ میں جو کنک منڈی سکول بھی کہلاتا تھا کھولا گیا۔ بعد میں اس کا نام سکاچ مشن ہائی سکول رکھ دیا گیا۔ اسی کنک منڈی سکول کو بعد میں انٹرمیڈیٹ کالج کا درجہ دے دیا گیا۔ شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، فیض احمد فیض، امریتا پریتم، نشتر میڈیکل کالج کے بانی پرنسپل ڈاکٹر بھٹہ اسی درسگاہ سے فارغ التحصیل ہیں۔ مرے کالج سیالکوٹ کے لئے ایک کثیر رقم ایک انگریزی فوجی افسر مرے صاحب نے عطیہ کے طور پر پیش کی اور ۱۹۰۹ء میں حالیہ جگہ پر اسی رقم سے کالج قائم کیا گیا۔ اسے مرے کالج کا نام دیا گیا۔

اسی کلیسیا میں ڈاکٹر ہارپر اور ڈاکٹر ینگسن نے بڑا کام کیا۔ ان کی تبلیغ کا نتیجہ تھا کہ بہت سارے لوگوں نے سیالکوٹ، گوجرانوالہ، ڈسکہ، وزیر آباد

گجرات اور جلال پور جٹاں میں خداوند یسوع کو بطور نجات دہندہ قبول کر لیا۔

ڈاکٹر ٹیلر نے ۱۸۷۹ء میں جلال پور جٹاں میں شیلوخ ہسپتال کھولا۔ اس کے علاوہ سیالکوٹ کینٹ میں سکول ڈسکہ میں بورڈنگ ہاؤس اور سکول قائم کئے۔ ڈاکٹر ینکسن کی کوشش سے شیخوپورہ میں ۱۸۸۶ء میں ایک مسیحی گاؤں ینکسن آباد کی بنیاد رکھی گئی۔

اس کلیسیا میں اسی ملک کے لوگوں میں سے قاضی خیر اللہ کے بیٹے ڈاکٹر فرینک خیر اللہ ہیں جو مرے کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ وہ بڑے زبردست ادیب، محقق اور مفکر گنے جاتے ہیں۔ اولاً ان کا تعلق اینگلیکن کلیسیا سے تھا۔ قاموس الکتاب ان ہی کی تصنیف ہے جو کلیسیا کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔

یہ کلیسیا ۱۹۷۰ء میں چرچ آف پاکستان کا ایک حصہ بن گئی۔ آج کل یہ ایک علیحدہ ڈایوسیس ہے جس کا ہیڈ کوارٹر سیالکوٹ ہے۔ یونین کے وقت اس کے پہلے بشپ ولیم۔ جی۔ ینگ تھے۔ ان کے وصال کے بعد صفدر قادر بخش ایک عرصہ تک بشپ رہے۔ مگر آج وہ بھی خداوند میں سو گئے ہیں۔ اُن کے بعد سموئیل پرویز بشپ بنے۔

اینگلیکن چرچ

یہ کلیسیا رومن کیتھولک کلیسیا کی طرح ملک بھر میں پائی جانے والی کلیسیا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب پنجاب اور سندھ پر قبضہ کر لیا تو انگریز سارے علاقہ میں بحیثیت فوجی موجود تھے۔ تمام کے تمام افسر اور سپاہی تو راستباز مسیحی نہ تھے مگر خداوند سے پیار کرنے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ بالخصوص ان فوجیوں کا قطار در قطار وردیوں میں ملبوس ہو کر گرجا گھر جانا ایک بہت بڑی گواہی تھی۔

۱۸۴۳ء تا ۱۸۴۹ء ان سات برسوں میں جب سندھ اور پنجاب کے

علاقے ملتے رہے، علاقے بنتے گئے تو جو عمارات مسیح کے نام لیواؤں کو ملیں وہی ان ولایتی اور دیسی مسیحیوں کے گرجا گھر بن گئے۔ لاہور میں انارکلی کا مقبرہ سب سے پہلا گرجا ٹھہرا۔

پشاور میں حکومت کی ایک پرانی عمارت کو تھوڑی دیر کے لئے بطور گرجا استعمال کیا گیا۔

انارکلی ۹ اکتوبر ۱۸۴۹ء تا ۱۸۸۷ء یعنی ۳۸ سال تک مسیحی عبادتوں کے لئے استعمال ہوتا رہا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے چند افسران جان لارنس، ہنری لارنس، منٹگمری، میکلوڈ، نکلسن، ہربرٹ، ایڈورڈ اور چارلس اور کئی سپاہی اور چھوٹے افسر مسیحیت کے اظہار میں سرگرم رہے۔ لیکن چونکہ ان کا کام پرچار کرنے کا نہ تھا لہٰذا وہ پرچار نہ کر سکے۔ اتنا ضرور ہے کہ انگریزی کمپنی نے روحانی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے چیپلن ضرور رکھے۔ اور ہر جگہ بدیسی اور ہندوستانی سپاہیوں کی روحانی بھوک اور پیاس مٹانے کی خاطر ساتھ ساتھ رہے۔

۱۸۵۵ء میں انگریز افسران اور سپاہیوں کی درخواست پر رابرٹ کلارک اور فینڈر کو پشاور بھیجا گیا تاکہ دونوں وہاں مسیحیت کے پرچار کا کام کریں۔ اینگلیکن کلیسیا نے شروع شروع میں مشنری کام اور پرچار کی طرف توجہ نہ دی۔ کیونکہ کلیسیائی امور حکومت نے سنبھال رکھے تھے۔ لہٰذا عملی بشارت میں اس کلیسیا نے دیر سے قدم اٹھایا۔

۱۸۷۷ء تک نہ صرف کلیسیائی کام حکومت کی زیرِ نگرانی رہا بلکہ حکومت نے کلیسیائے پاکستان کے لئے مختلف شہروں میں بڑے بڑے گرجے تعمیر کر کے ایک بہت بڑا احسان کیا جو کلیسیاؤں کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ ان عبادت گاہوں

کا فن تعمیر اور رنا ئل جو اس وقت کی حکومت نے تعمیر کیے منفرد اور محیر العقل ہیں ۔ ان کے اندر شیشوں پر منقش تصاویر، گرجا گھروں کے سنگ مرمر اور پیتل کی لمبی اور منقا روہ پلیٹوں پر مختصر تاریخ، خوبصورت اور فلک بوس ٹاور (مینار) انگریزی طرز کی گھنٹیاں، پیتل کے عقاب، محرابیں، اونچی قسم کا روسٹرم ROSTRUM بلند و بالا چھتیں، ویسٹری کا ساتھ بنایا جانا، موسیقی کے لئے بڑے آرگن یہ صرف اور صرف اسی حکومت کا طرۂ امتیاز ہیں۔ خدا نے اس برطانوی حکومت کو یوں ہی سرفراز نہ کیا تھا اور اس کا طوطی سارے جہان میں یوں ہی نہ بولتا تھا۔ خداوند سے محبت کا کچھ نہ کچھ پہلو ضرور نمایاں تھا۔

عالیشان گرجا گھر جو اس دور میں تعمیر کیے گئے ان کا بیان قارئین کے لئے ضرور دلچسپی کا باعث ہوگا۔

۱۔ سینٹ لوق چرچ	ایبٹ آباد
۲۔ سینٹ جارج چرچ	بنوں
۳۔ سینٹ تھامس چرچ	ڈیرہ غازیخاں
۴۔ کرائسٹ چرچ	گوجرانوالہ
۵۔ سینٹ تھامس چرچ	حیدرآباد
۶۔ سینٹ جان چرچ	جھنگ
۷۔ سینٹ جان چرچ	جہلم (دریا کے کنارے آج بھی نظر آتا ہے)۔
۸۔ ہولی ٹرنٹی چرچ	کراچی
۹۔ سینٹ جیمز چرچ	کھیوڑہ
۱۰۔ سینٹ آگسٹن چرچ	کوہاٹ

۱۱۔ کرائسٹ چرچ کوئٹری (پاکستان کا پہلا تعمیر شدہ گرجا)

۱۲۔ سینٹ اینڈ ریوز چرچ لاہور ریلوے ملازمین کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔

۱۳۔ سینٹ میری مگدلینی چرچ لاہور کینٹ ۱۸۵۲ء میں تعمیر ہوا۔ راقم الحروف بشپ مقرر ہونے تک اسی چرچ میں خداوند کی خدمت کر رہے تھے۔ اس کے سامنے آج بھی چارلس نیپیر فاتح پنجاب کا پتھر نصب ہے۔

۱۴۔ سینٹ پیٹرز چرچ	فیصل آباد
۱۵۔ سینٹ پال چرچ	منوڑہ کراچی
۱۶۔ سینٹ البن چرچ	مردان
۱۷۔ سینٹ آسولڈ چرچ	مغل پورہ، لاہور
۱۸۔ سینٹ میری چرچ	ملتان صدر
۱۹۔ ہولی ٹرنٹی چرچ	دی مال مری ۱۸۵۷ء میں تعمیر ہوا۔
۲۰۔ سینٹ میری چرچ	مظفر گڑھ
۲۱۔ سینٹ میری آف بیتھنی چرچ	کوئٹہ
۲۲۔ سینٹ میتھوز چرچ	نتھیا گلی
۲۳۔ کرائسٹ چرچ	نوشہرہ
۲۴۔ سینٹ جان چرچ	پشاور
۲۵۔ کرائسٹ چرچ	راولپنڈی
۲۶۔ سینٹ میری چرچ	راولپنڈی
۲۷۔ سینٹ پیٹرک چرچ	منٹگمری (ساہیوال)

۲۸۔ سینٹ فلپس چرچ — سرگودھا

۲۹۔ ہولی ٹرنٹی چرچ — سیالکوٹ

۳۰۔ سینٹ زیوئیرز چرچ — مری

دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب اس علاقے میں لاہور ڈایوسیس کا قیام ہوا اور ایک بشپ مقرر کیا گیا۔ سب سے پہلے کلکتہ سے کاٹن (۱۸۵۸۔۶۶) COTTON اور پھر بشپ ملمین MILMAN ۔ ڈایوسیس کی نگرانی کے لیے مقرر کیے گئے۔ دوری کے باعث وہ کبھی کبھار آتے کیونکہ وہ اس علاقے سے بھی بشپ ہوتے تھے۔ دوری کے باوجود اس بشپ کے کنٹرول میں دہلی، پنجاب، کشمیر اور سندھ کا علاقہ بھی ہوتا تھا۔ ان دنوں یہ علاقے دشوار گزار تھے۔ اس دشوار گزاری کے پیش نظر یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس علاقہ کے لئے علیحدہ بشپ مقرر کیا جائے۔

اس کلیسیا نے کئی دیگر نامور تعلیمی، طبی اور دینی ادارے قائم کئے۔

۱۔ بائبل سوسائٹی، انارکلی لاہور۔ ۱۸۶۳ء میں قائم ہوئی۔

۲۔ کرسچن ہسپتال، پشاور۔ ۱۸۸۳ء

۳۔ پنیل ہسپتال، بنوں۔ ۱۸۹۳ء

۴۔ کوئٹہ کرسچن ہسپتال۔ ۱۸۸۶ء

تھامس ویلپی فرنچ

ڈایوسیس کا قیام ۱۸۷۷ء میں عمل میں آیا اور انگلیکن چرچ کا باقاعدہ کام شروع ہوا۔ تھامس ویلپی فرنچ مسیح خداوند کا زبردست مبلغ اور مسیحیت کا عظیم علمبردار تھا۔ وہ ۱۸۵۱ء میں ہندوستان آیا۔ (وہ آگرہ میں خدمت سرانجام دے رہا تھا اور ایک دو بار پہلے بھی ۱۸۶۲ء میں لاہور اور ڈیرہ جات میں منادی کی خاطر آچکا تھا۔ اس کو بشپ مقرر کرکے اس علاقے میں بھیجا گیا)۔ ...

خادم تھا جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آگرہ کے قلعہ میں پناہ لینے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ جب تک ہندوستانی مسیحیوں کو قلعہ کے اندر پناہ نہیں دی جائے گی میں اندر قدم نہ رکھوں گا۔ یہ پُرعزم انسان غیر متزلزل ارادہ کا مالک تھا اور اس اٹل ارادہ پر ڈٹا رہا۔

یہی وہ مردِ صالح تھا جس نے لاہور ڈوینٹی کالج میان سنگھ باغ کی بنیاد رکھی۔ لاہور ڈایوسیس کا عالیشان، ملکوتی گرجا گھر دس سال کی سخت محنت کے بعد ۱۸۸۷ء میں اسی کے عہد میں مکمل ہوا۔ یہ گرجا گھر حال، ماضی اور مستقبل کی بے نظیر عمارت ہے۔ ایسی عمارت نہ تھی نہ ہے اور شاید نہ بن سکے۔ مندرجہ ذیل عمارات اسی عہد کی یادگار ہیں۔

۱۔ کیتھیڈرل سکول ہال روڈ۔ ۱۸۸۳ء

۲۔ اسٹیشن سکول راولپنڈی۔ ۱۸۸۳ء

۳۔ سینٹ ڈینیز سکول مری۔ ۱۸۸۲ء

پادری بروس کے ہمراہ ڈیرہ جات میں پہلی بار انجیل جلیل کی بشارت دینا فرنچ ہی کا کام تھا۔

کیتھیڈرل چرچ کی بلڈنگ پر اس زمانہ میں پچاس ہزار پونڈ ساگت آئی جو وقت کے مطابق ایک خطیر رقم تھی جو بڑی مشکلوں سے فراہم کی گئی۔ بلکہ اتنی بڑی رقم کا اکٹھا کرنا بھی اسی مردِ باہمت ہی کا کام تھا۔ آج پروٹسٹنٹ کلیسیا کا سب سے بڑا، عالیشان اور خوبصورت گرجا گھر یہی ہے۔

۱۸۸۸ء میں وہ عازم انگلستان ہوا مگر ۱۴ مئی ۱۸۹۱ء کو جب کہ وہ مسقط میں تھا خداوند نے اپنے بندہ کو اپنے پاس واپس بلا لیا۔ کیونکہ جس مقصد کے لئے وہ

VIVIENNE STACY - THOMAS V. FRENCH 1982 ؁

ہندوستان آیا تھا وہ خداوند نے پورا کر لیا تھا۔ اس کی قبر آج بھی سمندر کے کنارے واقع ہے۔

اگرچہ وہ نیوٹن، گورڈن، فورمن اور تامس ہنٹر کی طرح کا مشنری تو نہ تھا۔ اس کے باوجود کسی طور ان سے کم بھی نہ تھا۔ وہ پاکستان میں اینگلیکن کلیسیا کا پہلا بشپ تھا۔ یہاں یہ بات واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ فرینچ کی آمد سے پیشتر کلارک فینڈرز، بروس، فشر پیٹرک وغیرہ آچکے تھے۔

فشر پیٹرک وہ مشنری تھا جس نے ملتان میں سب سے پہلے کام شروع کیا تھا۔

گرامر سکول، ہولی ٹرنٹی چرچ کراچی، ایڈورڈز ہائی سکول پشاور، مشن سکول بنوں (چیتل ہائی سکول) ۱۸۵۰ء کی دہائی یا اس کے بعد فرینچ کے لاہور آنے سے پہلے تعمیر ہو چکے تھے۔

اینگلیکن کلیسیا نے بڑے بڑے جید عالم پیدا کئے۔ جن میں عماد الدین، دینا ناتھ، وارث الدین، احسان اللہ، برکت اللہ اور تاک کاشیری شامل ہیں۔ زیادہ کا تعلق نارووال سے ہے۔ یہ کلیسیا چونکہ برطانوی حکومت کی اپنی کلیسیا تھی اس لئے اسی نام سے نامزد تھی۔ اسے شاہی کلیسیا بھی کہا جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ شروع شروع میں اس کلیسیا کا بشارتی کام امیروں کے درمیان رہا اور غریبوں کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ رئیس مسلمانوں اور ہندوؤں میں سے جو بھی حلقہ میں آئے وہ اینگلیکن کلیسیا کے شرکا تھے۔

اس کلیسیا کے مشہور گاؤں کلارک آباد، ۲۲۴ منٹگمری والا اور عیسیٰ نگری ہیں۔

عبادتی نظام اور ترتیب کے لحاظ سے اس کلیسیا کا مقام ہمیشہ افضل رہا ہے

اور آج بھی اس مقام کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اینگلیکن کلیسیا کراچی کے پہلے پاکستانی بشپ چندو رے تھے اور اسی کلیسیا کے لاہور میں پہلے پاکستانی بشپ عنایت مسیح تھے جو ۱۹۶۸ء میں اس عہدہ پر فائز ہوئے۔ آجکل الیگزینڈر جان ملک ہیں۔

یہ کلیسیا یکم نومبر ۱۹۷۰ء کو چرچ آف پاکستان میں شریک ہوگئی۔

میتھوڈسٹ چرچ

میتھوڈسٹ کلیسیا کا بانی جان ویسلی تھا جس نے اس کلیسیا کی بنیاد انگلینڈ میں رکھی۔ لیکن پاکستان میں اس کلیسیا کا کام ۱۸۷۳ء میں کراچی میں شروع ہوا۔

کوئٹہ میں ۱۸۸۴ء میں اور لاہور میں ۱۸۸۰ء میں انگریز فوجیوں اور انگریزی زبان جاننے والوں کے درمیان بشارتی کام شروع کیا گیا۔ سب سے پہلا مشنری جو ہندوستان آیا وہ ولیم بٹلر WILLIAM BUTLER تھا۔

میتھوڈسٹ کلیسیا کا مشہور مشنری تھوبرن اور اس کی بہن ایزبلا تھوبرن یو۔ایس۔اے سے آئے۔ انہوں نے دہلی اور لکھنؤ میں بہت کام کیا۔

یہ مشنری پاکستان کی سرزمین میں بہت دیر سے آئے۔ لیکن انہوں نے کمترین لوگوں میں کام شروع کیا۔ اور کراچی، کوئٹہ، ملتان، خانیوال، میاں چنوں، شنوز آباد، رائے ونڈ اور لاہور میں اپنے مراکز کھولے۔ امریکن پریسبٹیرین کے ساتھ مل کر ایف۔سی اور کنیرڈ کالجز میں تعلیم کے پھیلاؤ کے لئے اتحاد کرلیا۔ اور اس طرح یو۔سی۔ایچ کی خدمت میں اے۔پی کے ساتھ مل گئے۔

۱۹۲۰ء میں ضلع ملتان میں شنوز آباد اور سات گاؤں کے لئے زمین خریدی اور بہت غریب علاقوں خاص کر سیالکوٹ اور گورداسپور وغیرہ سے مسیحیوں کو لا کر بسایا۔

بہاولپور اور بہاولنگر کے علاقوں میں ۱۹۴۰ء کی دہائی میں کام شروع کیا

گیا۔ بہاولنگر کے علاقہ کا دوسرا نام چولستان بھی ہے جو ریگستان ہونے کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ پسماندہ ہے۔ اس علاقہ میں بہاولنگر، چشتیاں، حاصل پور، ہارون آباد، فورٹ عباس میں بھی غریب عوام کے درمیان کام شروع کیا گیا۔ چولستان میں کام شروع کرنے کا سہرا پادری متھیاس، ایم۔ اے کیڈر اور پادری خوب داس کے سر ہے۔

میتھوڈسٹ کے مشہور ادارے شوز آباد سکول، لوسی ہیریسن، کرسچن انسٹیٹیوٹ رائیونڈ، ہولی ٹرنٹی گرلز سکول کراچی، ڈرگ روڈ ہائی سکول ہیں۔ شوز آباد اس کلیسیا کا سب سے بڑا گاؤں ہے۔ جس نے کلیسیا کے لئے اچھی خاصی لیڈر شپ پیدا کی۔ کلیسیا کے پہلے بشپ ی۔ ڈی۔ راکی۔ آرمسٹڈ اور پھر پہلے پاکستانی بشپ جے۔ ڈی سوئیل تھے۔ جو ۱۹۶۸ء میں مقرر ہوئے۔

۱۹۷۰ء میں یہ کلیسیا بھی چرچ آف پاکستان میں ضم ہو گئی تھی۔

سالویشن آرمی (مکتی فوج)

سالویشن آرمی کلیسیا انتظامی لحاظ سے وہ کلیسیا ہے جسے کبھی زوال نہیں آیا۔ جبکہ باقی کچھ کلیسیا ئیں اپنے پہلے والے مقام پر نہیں رہیں۔

اس تنظیم کے بانی جنرل ولیم بوتھ تھے۔ ان کا تعلق انگلینڈ سے تھا۔ وہ روحانی شعلہ بیان مقرر تھے۔ جب ۱۸۹۳ء میں وہ لاہور آئے تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ احسان اللہ انہی کے مترجم تھے۔ جو ان ہی کی وساطت سے مسیحی ہوئے تھے۔

سالویشن آرمی نے بھی غربا میں اپنا مسکن ڈھونڈا اور منادی کے کام کو خوب طریقہ سے کیا۔ مزنگ چونگی کے نزدیک اس کلیسیا کا ہیڈ کوارٹر موجود ہے۔ اس کا کام جھنگ، لاہور، فیصل آباد، خانیوال، شانتی نگر اور امرت نگر میں ہے۔

پاکستان میں اس تنظیم کا کام ۱۸۸۳ء میں لاہور سے شروع ہوا۔

لوتھرن چرچ

اس چرچ نے اپنا کام ڈینش خاتون کے ذریعہ مردان میں ۱۹۰۳ء میں شروع کیا۔

اگرچہ مردان اور دیگر پہاڑی علاقہ میں لوتھرن مشن نے ایک طویل عرصہ تک بشارتی کام کیا مگر پٹھانوں نے ہمیشہ مسیحیت کی مخالفت کی اور کئی مشنریوں کو شہادت کے درجہ تک پہنچایا۔ ۱۹۲۸ء میں تائب نامی شخص کو بپتسمہ دیا گیا۔ جب اس نے مسیحیت کو قبول کر لیا تو پشتو زبان کو انجیل کے ترجمہ کے لئے استعمال کیا تاکہ پٹھان انجیل بشارت کو جان سکیں۔ انہوں نے پسماندہ لوگوں میں بہت خدمت کی۔ ان کا کام ٹانک، ڈیرہ اسمٰعیل خان اور رسالپور میں شروع ہوا۔ اس کلیسیا کے تبلیغی کام کو ۱۹۶۰ء میں بڑی تقویت حاصل ہوئی کیونکہ فن لینڈ کی کلیسیا نے کافی سارے مشنریوں کو پاکستان میں بھیج دیا تھا۔ ۱۹۶۸ء میں ان کی تعداد سترہ سو کے قریب ہو گئی۔

اس کلیسیا نے ۱۹۷۰ء میں بشپ ارنی روڈون کی قیادت میں چرچ آف پاکستان میں شرکت کر لی۔ یہی مشنری بعد میں کراچی ڈایوسیس کے بشپ مقرر ہوئے۔

اے۔ آر۔ پی چرچ

اس کلیسیا نے منٹگمری ڈسٹرکٹ میں اپنا کام شروع کیا۔ آج کل اس علاقہ کا نام ساہیوال ہے۔ یو۔ ایس۔ اے سے اے۔ آر۔ پی مشن نے اپنی ایک خاتون کارندہ مس منی الیگزینڈر کو ۱۹۰۶ء میں بشارتی کام شروع کرنے کے لئے یہاں بھیجا۔

۱۹۱۰ء میں پادری اور مسز رونفسن بھی آئے۔ ڈاکٹر لوئینگ نے ان دونوں کو ساہیوال ڈسٹرکٹ میں کام کرنے کی ترغیب دی۔ اور یوں اس مشن کا کام شروع ہوا۔ پریسبٹیرین چرچ کی طرف سے غریب کمترین خاکروب لوگوں میں منادی کی گئی۔

اس مشن نے ۱۹۱۱ء میں ساہیوال NANCY FULLWOOD HOSPITAL نینسی فل وڈ ہسپتال کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۱۹ء کے بعد رفسن آباد، نو سے چک، پیو بتر چک، افغان چک، ڈاکٹر والا میں مسیحیوں کو آباد کیا۔ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے سکول کھولے گئے۔

آج کل ان کا کام بہاولپور اور کراچی میں بھی جاری ہے۔

اے۔ آر۔ پی چرچ وقتاً فوقتاً بحران کا شکار رہی ہے۔ اس کلیسیا کی مایہ ناز ہستیوں میں سے پادری پی۔ ڈبلیو ایٹ۔ پریسلی۔ مس حنا۔ مس ڈیگین بارٹ ہیں۔ مس ڈیگین بارٹ کو نرسنگ کے شعبہ میں نمایاں خدمت کے صلہ میں حکومت پاکستان نے تمغۂ خدمت بھی عطا کیا تھا۔

ٹیم مشن TEAM MISSION

اس تنظیم کا کام ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا۔ اس کی تفصیل جاننے کے لئے KAREN & PIETSCH کی لکھی ہوئی کتاب THE MOSAIC OF TEAM IN PAKISTAN کا مطالعہ معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ تنظیم NON-DENOMINATION ہے۔ اور بشارت کی دلدادہ۔ ۱۸۴۶ء میں ڈاکٹر اینڈ مسز اینڈ ریو کار۔ گارڈ ٹیکسلا میں آئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد ۱۹۴۷ء میں کارل اور ویگنس ڈیوس۔ میرین ٹمپل تشریف لے آئے۔ ۱۹۵۰ء میں ان لوگوں نے یو۔ پی چرچ سے علیحدہ ہو کر اپنے کام کی ابتدا کی۔ ان کا کام یہ

ہے۔

They faced the challenge of the mountains and valleys of the north.

انہوں نے شمال میں پہاڑوں اور وادیوں کے چیلنج کا سامنا کیا۔

آج اُن کا کام ایبٹ آباد، راولپنڈی، مانسہرہ، قلندر آباد، مری، حسن ابدال، واہ، سوات، ہری پور، تربیلا اور اٹک جیسی پہاڑی علاقوں میں ہے۔

۱۹۶۹ء میں بیس سال کے کام کے بعد دو سو اکیس لوگ اس گروہ میں شامل ہو گئے۔

زمین سخت ہے اور بیج کا اُگنا بہت محال ہے۔ کوشش جاری ہے کہ ٹریکٹ، بک سٹال، بشارت اور ہسپتال میں منادی کے ذریعہ لوگوں کو خداوند کا کلام سنایا جائے۔

ع ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

ایس۔ ڈی۔ اے

سیونتھ ڈے ایڈوینٹسٹ کلیسیا

اس کلیسیا کو شروع کرنے کا سہرا ڈاکٹر مان (MANN) کے سر ہے جنہوں نے ۱۹۱۳ء میں کام شروع کیا۔ صحت کے شعبہ پر زیادہ توجہ دینے اور اچھے ہسپتال قائم کرنے کی خاطر کراچی، لاہور، فاروق آباد اور نیاز بیگ ٹھوکر لاہور میں اپنے مراکز قائم کئے ہیں۔

بائبل سکول کے ذریعہ بھی خداوند کا پیغام غیر مسیحیوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ ان کی تعداد چند ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

پینتیکاسٹل اور برادران

پینتیکاسٹل کا کام ۱۹۳۳ء میں شروع ہوا۔ آج کل مختلف ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔ پینتیکاسٹل اور برادران اپنے خصوصی انداز میں بڑے زور شور سے بڑھ رہی ہیں۔ ان کا کوئی مخصوص علاقہ نہیں اور نہ ہی کسی قیود اور حدود سے بندھے ہیں۔ دعا کرنے، بدروحوں کو نکالنے، شفا دینے اور بالغ شخص کے بپتسمہ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ پاکستان کے ہر شہر میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے اکثر خادم تربیت یافتہ نہیں ہوتے مگر وہ تربیت یافتہ خادموں سے کہیں بڑھ کر جوشیلے اور خداوند کے لئے دکھ اٹھانے والے ہیں۔ ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اور دنیا بھر کی اس وقت مقبول ترین کلیسیا بنتی جا رہی ہے۔

شاید اس کا راز دعا اور روزہ میں مخفی ہے۔

برادران کا کام بھی پاکستان بننے کے بعد سے کافی ترقی پا گیا ہے۔ ان کے گروہوں کی تعداد ۱۰۰ سے تجاوز کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی کلیسیائیں مصروف عمل ہیں۔

حصہ اوّل

فخرِ کلیسیائے پاکستان (نام اور شخصیات)

اس باب کے حصہ اوّل میں ایسی نامور ہستیوں کا ذکر کرنا میرے لیے باعث صد افتخار ہے کیونکہ ان عظیم انسانوں کو کلیسیا کی خدمت انجام دینے میں طرہ امتیاز حاصل ہے۔ آج وہ سب کے سب ابدی آرام میں داخل ہو چکے ہیں۔ سوائے فینڈر کے خداوند میں ان تمام پیاروں نے اپنی اپنی زندگی میں اپنے عزیزوں، لواحقین اور والدین کو چھوڑ کر خداوند یسوع کو قبول کیا۔

(پاک کلام میں خداوند نے فرمایا۔ کس نے میری یا انجیل کی خاطر گھر یا بھائیوں یا بہنوں یا ماں یا باپ یا بچوں یا کھیتوں کو چھوڑ دیا) اُنکے والدین یا تو سکھ تھے یا مسلم۔ وہ مذہب تبدیل کر کے اور رُوحانی رُوپ میں ڈھل کر خداوند کی قربت حاصل کئے ہوئے تھے۔ خداوند کی رفاقت نے انہیں علم الٰہیات کا سمندر بنا دیا تھا۔ انہوں نے خداوند کی خاطر عظیم قربانی دی اور اپنے اپنے گھروں کو خیر باد کہہ کر اس کا ثبوت بھی فراہم کر دیا۔ حالانکہ تمام کے تمام آج کل کی بنیادی اور ضروری سہولیات زندگی سے قطعی محروم تھے۔ اس خدمت کو نبھانے کے لئے میلوں پیدل یا تانگے پر سفر کرتے رہے۔ خداوند کی صلیب کے سوا اور کسی چیز کو متاع حیات نہ سمجھا۔ زندگی کے ہر موڑ پر غیر مسیحیوں میں گھرے رہے اور بسا اوقات ایسے ایسے خطرات میں پڑے کہ زندگی اور موت کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا۔ کئی دفعہ موت کو اپنے رُوبرو دیکھا مگر خداوند کو ساتھ پاتے ہوئے کبھی نہ ڈگمگائے۔

آج وہ ہم میں نہیں مگر وہ کلیسیا کا فخر ضرور ہیں۔ وہ ہراول دستہ کے علمبردار تھے۔ مسیح خداوند کے خاص رتن تھے اور ہمیشہ کے لئے قد آور شخصیات گنے جائیں گے۔ ہزاروں اور لاکھوں انسانوں نے ان کے کلام اور کردار کی بدولت خداوند یسوع کو قبول کیا۔

خدا نے منطق اور علم سے اُن کو اس قدر نوازا کہ برصغیر پاک و ہند میں کوئی ان کے سامنے کھڑا نہ رہ سکتا تھا۔ ہر سوال کا وہ فی البدیہ جواب حاضر ہوتا کہ سننے والوں کے لئے حیرت و استعجاب کا موجب بن جاتا اور حیرانی کے عالم میں منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا۔

صد حیف کہ موجودہ نسل کو اُن کی زندگی کے متعلق کچھ بھی علم نہیں۔ اس تصنیف کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہماری موجودہ اور مستقبل کی نسل اپنے اسلاف سے بے بہرہ نہ رہے۔ بلاشبہ ان کو دیکھا تو نہیں جا سکتا مگر جانا جا سکتا ہے۔

ہم کو علم ہونا چاہئے کہ یہی لوگ کلیسیا کے اُفق پر کس قدر روشن تھے اور ان کی تابانی ابھی تک قائم ہے۔ کبھی کسی نے ان کی بابت جاننے کی سعی ہی نہیں کی بلکہ کسی کتاب کو چھوا تک نہیں۔ پس ہر مسیحی پر لازم ہے کہ ان حقائق پر سے پردہ اٹھائے تا کہ ان اسلاف کو دیکھا اور جانا جا سکے کیونکہ

OUR PAST IS A LESSON AND OUR FUTURE IS A CHALLENGE

ہمارا ماضی ایک سبق ہے اور مستقبل ایک چیلنج۔

آیئے ان شخصیات کی زندگیوں سے فیض حاصل کریں جنہوں نے کلیسیائے پاکستان کی آبیاری کی۔ تا کہ وہ جو زندہ کے تخت کے سامنے کھڑے قدوس، قدوس کہتے ہیں اور کلیسیا کا فخر ہیں ان کو روح کو خوشی میسر آئے کہ ایک پیاسی بھیڑ نے مسیحی

علمبرداری زندگی سے استفادہ کر کے آب حیات کے چشمہ کو پالیا ہے۔

یہ نامور ہستیاں ہیں جن کے بارے میں کچھ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

۱۔ کارل۔ جی۔ فینڈر	ڈی۔ ڈی
۲۔ آئی۔ ڈی۔ شہباز	ڈی۔ ڈی
۳۔ سوامی سُندر سنگھ	ہندو پاک کا پولس
۴۔ سلطان محمد پال	معروف مناظر
۵۔ برکت اللہ	بادشاہ قلم
۶۔ عبدالحق	شہنشاہ تحریر و تقریر و منطق و مناظرہ

پادری کارل۔ جی۔ فینڈر (ڈی۔ ڈی)

ان نامور شخصیات میں سے پادری کارل۔ جی۔ فینڈر بدیسی تھے اور دیگر تمام اسی خطہ ارض کی پیداوار تھے۔

کارل۔ جی فینڈر ۱۸۰۳ء میں واٹم برگ جرمنی میں پیدا ہوئے۔ نوجوانی کے عالم میں بائبل مشنری کالج میں زیر تعلیم رہے۔ وہ خداداد قابلیت کے مالک تھے۔ زبانیں سیکھنے کا شوق اُن میں بدرجہ اُتم موجود تھا۔ بلوغت کے زمانہ میں (۲۲ سال) انہیں آرمینیا بھیج دیا گیا۔ جہاں انہوں نے ترکی، فارسی اور آرمینی زبانوں پر دسترس حاصل کر لی۔ ۱۸۳۱ء میں وہ ایران گئے۔ ۱۸۳۳ء میں جرمنی کی ایک دوشیزہ صوفیہ ریوس سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ۱۸۴۰ء میں بائبل کمیٹی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور چرچ مشنری سوسائٹی نے انہیں قبول کر لیا۔ ۱۸۴۱ء میں آگرہ آ کر اس گھر میں سکونت پذیر ہو گئے جہاں ہنری مارٹن عبدالمسیح کے گھر آیا کرتے تھے۔ عبدالمسیح نے ہنری مارٹن ہی کی منادی کی بدولت خداوند کو قبول

عبد المسیح سی۔ ایم۔ سی کا پہلا ہندوستانی کارندہ تھا۔ جس نے ہنری مارٹن کے ساتھ مل کر انجیل کر ترجمہ کیا۔ اور وہ دورِ جدید میں اہلِ اسلام میں سے ۱۸۲۵ء میں پہلا خادم الدین تھا جو مسیح خداوند کے قدموں میں آیا اور چودہ سال خداوند کی خدمت کرنے کے بعد ابدی آرام میں داخل ہو گیا۔

فینڈر جرمن نژاد تھا مگر اس نے ہندوستان آ کر اردو زبان سیکھی اور شہرۂ آفاق کتاب میزان الحق لکھی جس نے تہلکہ مچا دیا۔ اسی تحریر کی وجہ سے کراچی سے عبداللہ آتھم، صفدر علی اور عماد الدین جیسے افراد مسیحی ہوئے۔ کئی لوگوں نے میزان الحق کے مطالعہ کے بعد مسیحیت اختیار کر لی۔

۱۸۵۵ء میں فینڈر رابرٹ کلارک کے ہمراہ پشاور بھیجے گئے۔ انہوں نے بازار میں کھڑے ہو کر بے دھڑک منادی کی۔ بشپ فرنچ جیسے لوگوں نے فینڈر کے قدموں میں بیٹھ کر اسلام کا مطالعہ کیا۔ اور تا دمِ مرگ اس کے مداح رہے۔ فینڈر اگرچہ جرمن تھا مگر اس نے اہلِ اسلام سے آگرہ، دہلی اور پشاور میں مناظرے کئے اور ان پر غالب رہے کیونکہ وہ علم کا سمندر تھے۔

سر ولیم میور نے ۱۸۵۴ء میں لکھا[1] کہ وہ اپنے عہد میں اہلِ اسلام سے مناظرہ کرنے والوں میں لائق ترین انسان تھا۔ ۱۸۵۷ء میں پشاور کے بازار میں منادی کرتے اور مناظرہ کرتے ہوئے فینڈر کو جب منع کیا گیا تو اس نے ایک زبردست بات کہی۔

خدا نے یہ ہولناک[2] دن (غدر یا جنگ آزادی کے ایام کی طرف اشارہ کیا تھا) برطانوی حکومت پر اس لئے بھیجے تھے کیونکہ وہ ہندوستان میں بت پرستی سے

1۔ صلیب کے علمبردار از پادری برکت اللہ۔ پی۔ آر۔ بی۔ ایس ۱۹۵۷ء ص ۲۵

2۔ کلام حق۔ شمارہ جولائی ۱۹۹۳ء

خائف ہو کر مسیحیت کے پرچار سے گریزاں رہے۔

ڈاکٹر فینڈر ایک بے باک اور نڈر مسیحی خادم تھے۔ وہ اپنے زمانے کے زبردست عالم تثلیث والوہیت اور دقیق مسائل کے ماہر اور مقرر تھے۔ وہ ۱۸۶۵ء میں انگلستان میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کی شہرۂ آفاق تصانیف میزان الحق، مفتاح الاسرار، طریق حیات اور مراسلات ہیں۔ لیکن میزان الحق جیسی کتاب ہندو پاکستان میں بہت کم لکھی گئی۔

مقام افسوس ہے کہ اس ہستی کی بابت لوگوں کو کچھ زیادہ واقفیت نہیں۔ وہ منطق سے بات کرتے تھے۔ ان کی باتیں مدلل اور استدلال سے پر ہوتی تھیں۔ وہ نہ صرف اپنے مذہب کی بابت جانتے تھے بلکہ دوسرے مذاہب کے متعلق بھی بہت علم رکھتے تھے۔ ان کے لئے یہ کہنا کہ وہ بے مثل اور جید عالم تھے واجب و مناسب ہے

فینڈر اور رابرٹ کلارک وہ پہلے مشنری تھے جنہوں نے پشاور کے گرد و نواح میں کلیسیائیں قائم کیں

پادری امام دین شہباز (ڈی۔ ڈی)

پادری امام دین شہباز آئی۔ ڈی شہباز کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہاں تک کہ ان کا اصل نام اس کے نیچے چھپ کر رہ گیا۔ وہ ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ نارووال سے ایک میل دور ایک گاؤں غازی وال میں جنم لیا۔ مسیحیت کے چند لعل جو گدڑیوں میں چھپے ہوئے ہیں اور بیش قیمت ہیں وہ سدا بہار پھول کی مانند مسکراتے رہیں گے اور خوشبو سے کبھی محروم نہ ہوں گے۔ وہ اس پادری صاحب کی شکل میں ہوتے ہیں۔

وہ سیالکوٹ کنونشن کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے

پریسبٹیرین چرچ میں پہلے معلم اور پھر پاسبان کی حیثیت سے خدمت کی۔ زندگی کے آخری حصہ میں جب وہ بصارت سے محروم ہو گئے تھے پنجابی زبوروں کا منظوم ترجمہ کیا۔ اُن کا ایک وفادار ساتھی صادق مسیح زبور پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ اور آپ اُسے پنجابی اشعار میں تبدیل کروایا کرتے تھے۔ آپ نے باقی ماندہ زندگی زبوروں کو موجودہ شکل میں لانے میں گزاری۔ آپ نے سیالکوٹ یو۔ پی کلیسیا میں ۱۸۸۶ء تا ۱۹۰۶ء یعنی بیس ۲۰ سال خدمت کی۔ ۱۹۲۱ء میں خداوند کا یہ عابد بھلوال ضلع سرگودہا میں ابدی نیند سو گیا۔

ی۔ ٹی۔ آئی میں لڑکوں کا ایک ہوسٹل آپ کے نام سے موسوم ہے۔

کلیسیائی خدمت میں آپ کے ساتھ جانب منزل جانے والے قافلہ میں ان ایمانداروں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ آرچ ڈیکن احسان اللہ، پادری گنڈا مل، پادری سکو مل، پادری بھولا مل، پادری طوطا چند۔ یہ گروہ سیالکوٹ، پسرور، نارووال اور گوجرانوالہ میں شانہ بشانہ کام کرتا رہا۔ زبوروں کا ترجمہ کرنے کی بدولت آپ کا نام رہتی دنیا تک پاکستان کی کلیسیا کا درخشاں ستارہ رہے گا۔

سادھو سُندر سنگھ[1]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ برصغیر ہندو پاک میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اس پاکباز سے ناواقف ہو۔ سوامی سندر سنگھ کو اس خطۂ ارض میں ہندو پاک کی کلیسیا کا پولس رسول کہا جاتا ہے۔

آپ ۱۸۸۹ء میں لدھیانہ کے سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مشن سکول میں زیرِ تعلیم رہے۔ بچپن سے ہی مسیحیت کے دشمن تھے اور بائبل مقدس کے اوراق

---

[1] سرمایۂ حیات از ایس۔ کے داس اپرویز سلطان سینٹر کونسل آف چرچز۔ لائن پر عکرز لاہور ۱۹۸۴ء

آگ کی نذر کر دینا ان کا شیوہ تھا۔ لیکن ایک رات اس قدر بیقراری پیدا ہوئی کہ تہیہ کر لیا کہ آج گاڑی کے نیچے آ کر زندگی سے منہ موڑ لیں گے۔ خداوند یسوع مسیح نے فرمایا ''میں آج اور ہمیشہ تک تمہارے ساتھ ہوں''۔ وہ اسی رات ان پر ظاہر ہوئے۔ انہوں نے خداوند کو جان لینے کے بعد ۱۹۰۵ء میں جب کہ سولہ برس کے تھے بپتسمہ لیا۔ اپنے پرائے سب ان کے دشمن ہو گئے۔ باپ نے گھر سے نکال دیا۔ قائل کرنے کی غرض سے والدین نے اُن کی جواں سال منگیتر کو اُن کے پاس بھیجا کہ شاید مسیحیت کو اپنانے کی بجائے واپس لوٹ آئیں مگر کوئی ان کی دلی کیفیت سے آگاہ نہ تھا۔ انہوں نے خداوند کو روبرو دیکھا تھا۔ اب ان کی حالت یہ تھی کہ کون مجھے خداوند سے جدا کر سکتا ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر اپنی منگیتر کو بہت ہی خوبصورت جواب دیا کہ وہ لاجواب ہو کر رہ گئی۔

''میرے پاس ایک ہی دل تھا جو میں نے مسیح خداوند کو دے دیا ہے دوسرا کہاں سے لاؤں''

آپ تبت، نیپال، ہمالیہ کے دامن، موجودہ پاکستان، انگلینڈ، جرمنی، فرانس، فلسطین، چین، برما میں خداوند کا پیغام لے کر پھرتے رہے۔

آپ کے ہاتھ میں صرف بائبل مقدس اور ایک کمبل ہوا کرتا تھا۔ اکثر کیسری چوغہ زیب تن کرتے تھے۔

تبت میں اُنہیں دو دن تک ایک کنوئیں میں بند رکھا گیا لیکن خداوند نے معجزانہ طریقہ سے انہیں باہر نکال دیا کہ لوگ انگشت بدندان رہ گئے

اُن کی زندگی پولس رسول سے مشابہ ہے کہ جوانی میں اپنے آپ کو خداوند کو دے دیا۔ والدین، بہن بھائیوں اور منگیتر سب کو مسیح خداوند کی خاطر چھوڑ دیا۔ پولس ہی کی طرح مگر بند کمرے میں خداوند کا نور اُن کے گرد چمکا۔ آپ

ہندوستان، پاکستان اور دنیا میں منادی کی خاطر نکل پڑے۔ اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو ان کا ارادہ تھا کہ ساری دنیا میں انجیل کو خوشخبری پھیلائیں۔

سادھو جی جوانی کے ایام میں گاہے بگاہے یہاں شملہ باغ آیا کرتے تھے۔ آج بھی ان کے ہاتھ کا لگا ہوا پتھر لاہور ڈایوسیس (سی۔ او۔ پی) اور اواڑہ کے ایک گرجا گھر میں نصب ہے۔ ۱۹۲۹ء میں وہ ہمالیہ پہاڑ پر گئے تو پھر واپس نہ آئے۔ ان کی کچھ خبر نہیں۔ ان کی بابت بوثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ وہ ''خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور خداوند نے اچانک اُسے اُٹھا لیا۔''

سلطان محمد پال

آپ ایس۔ ایم پال کے نام سے مشہور تھے۔ لوگ دراصل انہیں اسی نام سے پکارا کرتے تھے۔ آپ ۱۸۸۴ء[لہ] میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اگست ۱۹۰۲ء یعنی انیس برس کی عمر میں بپتسمہ حاصل کیا۔ پادری سلطان محمد پال کا نام آج بھی کلیسیاؤں میں نہایت عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ آپ مناظرہ، بحث اور کلام کرنے میں بڑی فصیح و بلیغ شخصیت کے مالک تھے اور اس میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ آپ کا شجرہ، نسب افغانستان سے متعلق ہے۔ اوائل عمری میں آپ بمبئی کے مدرسہ عربیہ میں بحیثیت طالب علم رہے۔ جوانی میں مسیح خداوند کو قبول کیا تو سلطان محمد کے ساتھ پال کا اضافہ کر لیا۔ آپ قادر الکلام تھے اسی لئے لوگ سیالکوٹ، لاہور اور دیگر کنونشن میں آپ کا کلام سننے کے لئے دور دور سے آیا کرتے تھے۔ آپ نے چند سال ایف۔ سی کالج میں بھی درس و تدریس کا پیشہ اپنائے رکھا۔ وہ یہاں عربی پڑھانے پر مامور تھے۔ صرف درس و تدریس میں نہیں بلکہ غیر

لہ میں کیوں مسیحی ہو گیا۔ سلطان محمد پال ۱۹۵۸ء

دری میدان میں بھی بہت شیریں سخن اور شیریں مقال تھے۔

آپ کو عربی، فارسی اور اردو میں دسترس حاصل ہونے کی وجہ سے غیر مسیحیوں کو آپ کے پاس پھٹکنا مشکل ہوتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پادری سلطان محمد پال اور مولوی عبدالحق کے بعد کلیسیائے ہندو پاکستان میں اُن کے پایہ کا عالم پیدا نہ ہوسکا۔ اُن کی شہرت کی بدولت لوگ اُن کو ایک نظر دیکھنے کے مشتاق ہوتے تھے۔ کونوینشن اور بیداری کی میٹنگ کی شان اور رونق ہوتے تھے۔ ایسے لوگ جب دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں تو کلیسیا کو ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے جس کی صدیوں تلافی نہیں ہوسکتی۔

کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو

تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

اُن کی تاریخ وفات کے بارے میں تو علم نہیں مگر یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ برکت اللہ کے ہم عصر تھے۔

برکت اللہ

آپ کے والد ماجد رحمت اللہ خواجہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور رشتے میں آرچ ڈیکن احسان اللہ کے بھتیجے تھے۔ آپ کو ۷ رجولائی ۱۹۰۷ء کو نارووال کی کلیسیا کے روبرو بپتسمہ دیا گیا

کلیسیائے پاکستان میں نارووال ایک ایسا قصبہ ہے جسے مردم خیز کہنا بجا ہے مگر اس کے نام پر دھبا یہ ہے کہ یہ مردم شناس نہیں۔ جہاں تک مردم خیزی کا تعلق ہے اس شہر اور گردونواح نے کلیسیائے پاکستان کے نامور سپوتوں کو جنم دیا ہے۔

اُن میں سے دینا ناتھ، وارث الدین، احسان اللہ، عبداللہ آتھم، آئی۔ڈی
شہباز (غازی وال)، رحمت مسیح واعظ، شیر سنگھ، حمید الدین سالک، میراں بخش
عطار، اور برکت اللہ بہت نامور ہوئے۔[1]

اگرچہ نارووال میں پادری فنیز پیٹرک آ چکے تھے لیکن مندرجہ بالا اشخاص
پادری رولینڈ بیٹ مین کی وجہ سے مسیحی ہوئے۔

برکت اللہ نے اپنے کیریر کا آغاز بطور لیکچرار ایڈورڈز کالج سے کیا اور
فلسفہ کے اُستاد مقرر ہوئے۔ بعد میں فیلو آف رائل ایشیا سوسائٹی F.R.A.S کے
ممبر چنے گئے۔

خدمت میں آنے کے بعد آپ پہلے لاہور کیتھیڈرل میں کینن اور پھر
امرتسر میں آرچ ڈیکن کے عہدہ پر متمکن ہوئے۔ زندگی کے اختتام پر دہلی میں خدمت
انجام دیتے ہوئے ۱۹۲۰ء میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور وہیں سپرد خاک
ہوئے۔ پادری برکت اللہ کی خدمت بے مثل اور لافانی ہے۔ خدمتِ تصنیف میں
اُن کو لاثانی مقام حاصل ہے۔ وہ اپنی طرزِ خدمت میں ہند و پاکستان کی کلیسیاؤں
میں ہمیشہ زندہ اور درخشاں رہیں گے۔

ایک بزرگ نے چند سال قبل اُن کے اوصاف پر تبصرہ کرتے ہوئے
کہا۔ برکت اللہ کی تحریر کردہ کتابیں کلیسیائے پاک و ہند کا انمٹ سرمایہ ہیں''۔
راقم الحروف کی نظر میں '' وہ تاریخ کلیسیائے پاک و ہند'' کے لکھنے میں دسترس
رکھتے تھے۔ اور تحریر میں اُن کا کوئی نعم البدل نہیں تھا۔

قارئین، اُن کی خداداد لیاقت و قابلیت نے کلیسیا کی بہتری کے لئے کیا

---

[1] برکت اللہ کلیسیائے پنجاب کا داتا معمار (احسان اللہ) پی۔آر۔بی۔ایس لاہور۔
کلیسیائے نارووال کا آغاز صفحہ ۱۲، ۱۹۵۹ء

پر کیا، اس کا اندازہ ان کی بائیس کتابوں سے لگا سکتے ہیں ۔

ان کا ہر کارنامہ ایک احسان عظیم کے طور پر شامل رہا اور رہے گا ۔

ان کی تحریر اور کارناموں کا ثبوت کچھ یوں ہے ۔

۱۔ قدامت و اصلیت اناجیل اربعہ ۔

۲۔ صحت کتب مقدسہ ۔

۳۔ اسلام یا مسیحیت ۔

۴۔ اشتراکیت اور مسیحیت ۔

۵۔ ابوت الٰہی ۔

۶۔ کلمۃ اللہ کی تعلیم ۔

۷۔ مسیحیت کی عالمگیری ۔

۸۔ مقدس توما رسول ہند ۔

۹۔ صلیب کے ہراول ۔

۱۰۔ صلیب کے علمبردار ۔

۱۱۔ کلیسیائے پنجاب کا دانا معمار ۔ احسان اللہ (آر چند لیمن) ۔

انگلستان کے عوام کا مقولہ یاد رکھے جانے کے قابل ہے کہ جب تک ہمارے پاس شیکسپیر کے ڈرامے موجود ہیں ہمارے پاس سب کچھ ہے ۔ اس مقولہ سے ہم یہ مقولہ اخذ کر سکتے ہیں کہ خداوند کے کلام پاک کے بعد اگر ہمارے پاس کوئی قیمتی شے موجود ہے جسے کلیسیاء کا سرمایہ کہا جا سکتا ہے تو وہ ہیں آر چند لیمن برکت اللہ کی کتابیں ۔

ع

" مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا ۔ "

پادری عبدالحق

چھٹے اور آخری نمبر پر پادری عبدالحق کا ذکر اس لئے کروں گا کیونکہ چند برس ہوئے وہ اس دنیا سے رُخصت ہو گئے۔ وہ پنجاب کے باسی تھے۔ اور گوجرانوالہ کے قریب ایک گاؤں جواتیاں کے ایک مُسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ ایسے چشم و چراغ تھے جو والدین کے لئے تفاخر کا باعث ہوتے ہیں۔ اُن کے والد صاحب کا نام مولوی محمد عظیم تھا۔

عہد شباب کو چھو رہے تھے کہ سرگودھا مشن ہسپتال جانے کے اتفاق ہوا۔ دیوار پر لکھی ہوئی بائبل مقدس کی اس آیت پر نظر پڑی۔

"یہ بات سچ اور ہر طرح سے قبول کرنے کے لائق ہے کہ مسیح یسوع گنہگاروں کو نجات دینے کے لئے دنیا میں آیا جن میں سب سے بڑا میں ہوں" (۱۔ تیمتھیس ۱:۱۵)

آپ نے اس آیت کو جونہی پڑھا فوراً اس حقیقت کی طرف خیال گیا کہ یہ کسی شخص کا ذاتی تجربہ[1] ہے۔

پولوس رسول کے یہ الفاظ اُن کے لئے مسیح خداوند کے قدموں میں آنے کا سبب بن گئے۔ تقریباً ساٹھ برس تک وہ ہندو پاکستان کی کلیساؤں میں خداوند مسیح کا پیغام دیتے رہے۔ اُن کے سب سے بڑے فرزند اکبر عبدالحق نے سول سروس کا امتحان پاس کیا تو باپ نے کہا۔

---

۱ پادری عبدالحق نے اپنی یہ گواہی ۱۹۶۱ء میں گوجرانوالہ سیمنری میں طلبا کو دی جب انہوں نے وہاں تھوڑی دیر قیام کیا تھا۔ ان طلباء میں راقم الحروف کے بڑے بھائی پادری وسعت خوب داس بھی موجود تھے۔

''بیٹا! تم خداوند کی خدمت کے لئے پیدا ہوئے ہو نہ کسی دوسری مروّت کے لئے''

اکبر پادری بن گئے۔ وہ ہیں تو بہت بڑے عالم مگر باپ کے پایہ کے نہیں ہیں۔ پادری عبدالحق ۱۹۸۰ء میں چندی گڑھ (انڈیا) میں خداوند میں سو گئے۔ پادری عبدالحق مناظرہ اور منطق میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے بلکہ پادری عبدالحق اور پادری سلطان محمد پال یکتائے روزگار تھے۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ کئی مناظرے کئے۔ مگر ساہیوال کنونشن میں اس بات کی گواہی دی کہ میں محض مناظر تھا۔

''میں نے لوگوں کو مناظرے کے میدان میں پچھاڑا ضرور ہے۔ مگر میں خداوند کے لئے ایک بھی روح کو نہ جیت سکا۔''

اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ایک معمولی ہستی تھے۔ بلکہ وہ کلیسیا کا فخر تھے۔ پاکستان کا ہر ذی عقل انسان ان کے نام سے واقف ہے۔

میتھوڈسٹ کلیسیا سے تعلق رکھنے کے باوجود کبھی کلیسیائی بندھن پر فخر نہ کیا بلکہ وہ صرف مسیحی تھے اور بس۔ انہیں شہنشاہِ تحریر و تقریر اور منطق و مناظرہ کا لقب بھی دیا گیا۔ مناظرہ اور کلام پیش کرنے میں علم الٰہیات کی باریکیوں کو پیش کرنا ان پر ختم تھا۔

پادری عبدالحق کے نام سے غیر مسیحی کانپ اُٹھتے تھے۔ ڈاکٹر ڈسکوی سابق پرنسپل گارڈن کالج راولپنڈی نے ایک دفعہ کہا۔

HE WAS THE MOST REASONABLE & LOGICAL MAN

I EVER SAW IN MY LIFE

وہ کسی ایک کلیسیا کے نہیں پورے ہندو پاکستان کے سپوت تھے۔ جن پر بجا طور پر فخر

کیا جا سکتا ہے۔

جب ۱۹۶۱ء میں لاہور کنونشن میں آئے تو لوگوں کا ایک اژدہام ہوا جو شاید
اُن کو ملنے کے لئے آیا کہ اس سے پہلے اور بعد میں بھی دیکھنے میں نہ آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ مادرِ کلیسیا نے پادری عبدالحق جیسے فرزند بہت کم پیدا کئے
ہیں۔

حصہ دوم

حصہ دوم میں تین شخصیات کے ذکر ہے۔ یہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے ایک علاقہ کا انتخاب کر لیا اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ وہیں مصروفِ خدمت رہے اور ساری زندگی خداوند کی یاد میں گزار دی اور اپنے وطن مالوف کو یوں خیر باد کہہ کر مسیح خداوند کے پیار، اور انسانیت کی خدمت اور بہبودی میں تن من دھن قربان کر دیا۔ ایسے ایسے وقت بھی آئے کہ خداوند کی خاطر قربانی سے بھی نہ گھبرائے۔ ان کا ایمان ٹھوس بنیادوں پر تھا اسی لئے ایمان میں کبھی لغزش نہ آنے پائی۔

کسی کونے کھدرے میں بغیر سہولیات زندگی، موٹر گاڑی اور بجلی وغیرہ کے گزارا کرتے رہے۔ اور وقت مقررہ پورا ہونے پر خداوند میں سو گئے۔

اُن کا نام تاریخ کلیسیائے پاکستان سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انہوں نے اپنے اپنے دور افتادہ علاقوں میں گرانمایہ خدمات سر انجام دیں۔

وہ ناموری سے اس لئے محروم رہے کیونکہ انہیں تاریخ کے اوراق کی زینت نہ بنایا گیا۔ بہت کم لوگوں نے اُن کے بارے میں لکھا۔ ایک سبب اور بھی ہے کہ بنجر اور سنگلاخ علاقہ میں رہے جہاں ان پڑھ اور پس ماندہ لوگ آباد تھے۔ ان کی ناموری قائم رکھنے اور اُن کی خدمت کو محفوظ کرنے کی خاطر ان کا ذکر تاریخ کے اوراق کی زینت بنا کر ہم نے خدمت کا تھوڑا سا صلہ ادا کر دیا ہے۔

ان تینوں میں سے سب سے پہلے اور پرانے پادری رولینڈ بیٹ مین تھے جن کا ذکر پہلے آنا چاہیے۔

پادری رولینڈ بیٹ مین (نارووال)

REV, ROWLAND BATEMAN

چرچ مشنری سوسائٹی نے پادری رولینڈ بیٹ مین کو نارووال کے علاقہ میں بھیجا۔ یہ ایک قصبہ ہے جو دریائے راوی کے جسڑ پل کے قریب شمالی سمت واقع ہے۔ دریائے راوی دو ضلعوں سیالکوٹ اور گورداسپور کو جدا کر کے حد بندی کا کام کرتا ہے۔ اُن دنوں اس علاقہ میں نہ ریل کا انتظام تھا اور نہ ہی پختہ سڑک تھی۔

۱۸۷۰ء میں خداوند کا یہ جیالا سپاہی پادری بیٹ مین جو خداوند کے روح سے معمور تھا نارووال آیا۔ بشارت کو ہر چیز پر ترجیح دیتا تھا۔ وہ اہل نارووال کی روحوں کا جیتنے کا پیاسا تھا۔ اس نے محلہ خواجگان میں رہائش اختیار کر لی۔ مرحوم نعمت اللہ کے پڑوس میں ایک کچا مکان انہیں مل گیا۔ اُن کی بازاری منادی اور مشن سکول میں پرچار کا نتیجہ یہ ہوا کہ یکے بعد دیگرے کئی طلبا خداوند یسوع مسیح منجی جہاں کے قدموں میں آ گئے۔

شیر سنگھ، رحمت مسیح واعظ، حمید الدین سالک، دینا ناتھ، عطارد، پرتھودتہ، ایم سرکار، برکت اللہ، عبداللہ آتھم اس وقت یہ افراد کلیسیا کے ارکان نہیں تھے۔ ہر طرف شور مچ گیا مگر خداوند کا خادم ڈٹا رہا۔ اور ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں میں خداوند کا کلام سناتا رہا۔

یہ بیٹ مین ہی تھے جنہوں نے آرچڈیکن احسان اللہ کو ۱۸۷۸ء میں بپتسمہ دیا۔ نارووال کا موجودہ لیکن تواریخی گرجا گھر بیٹ مین کے عہد میں ۱۸۹۲ء میں مکمل ہوا۔ بشپ میتھیوز جو لاہور کے دوسرے بشپ تھے ان کے ہاتھوں مخصوصیت ہوئی۔ نو۔ تک سنگھ بھی آپ ہی کے زیر انتظام رہا۔ بلکہ کچھ عرصہ اس علاقہ میں

گزارا۔۱۹۰۲ء میں یہ فخر کلیسائے نارووال ہمیشہ کے لیے اپنے وطن انگلستان واپس چلے گئے۔

بیٹ مین عظیم خداوند کے عظیم خادم تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ نارووال اور اس کے قرب و جوار میں خداوند کے کلام کی وجہ سے مسیحیت پھیلی اور روح القدس کے کام ہوئے تو اس کا سہرا سر بیٹ مین کے سر ہے۔

آج نارووال لڑکوں کے ہوسٹل کا نام بیٹ مین ہاسٹل اور عیسیٰ نگری (ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نزدیک) گاؤں کا اصل نام بیٹ مین آباد ہے

بنّوں کے پینل

THEODORE PANELL

ہم راہ وفا میں جینے کو۔ سمجھتے ہیں شہادت سے بھی سوا
اک عمر کی خدمت مشکل ہے اک وار کو احساں کہتے ہیں۔

تھیوڈور ۱۸۶۷ء میں انگلستان میں پیدا ہوئے۔۱۸۹۱ء میں طب کا بہت بڑا امتحان ایف۔آر۔سی۔ایس (F.R.C.S) پاس کر لیا۔ ایسے طبیب کے لئے مستقبل روشن تھا مگر انہوں نے اس خداداد قابلیت اور لیاقت کو خداوند کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا کہ مشنری بن کر بغیر تنخواہ کے اس کار خیر کو انجام دوں گا۔ اور یہ بھی کہ سخت سنگلاخ، اونٹ کتاروں، خار دار اور بنجر زمین میں جہاں خداوند کا کلام نہیں پہنچا ضرور پہنچاؤں گا۔ ڈاکٹر پنیل ۱۸۹۳ء میں بنوں تشریف لائے۔ اس وقت یہ سارا سرحدی علاقہ پنجاب میں شامل تھا۔ لیکن ۱۹۰۱ء میں دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے بہت سارے علاقہ کو صوبہ پنجاب سے علیحدہ کر کے شمال مغربی سرحدی صوبہ بنا دیا گیا۔

انہوں نے ڈیرہ اسمٰعیل خاں، وادی قرم، پاراچنار، بہادر خیل میں

خداوند کا پیغام سنانے کا کام شروع کر دیا۔ اُن کی آمد سے پیشتر مشن سکول ۱۸۶۵ء میں یہاں کھل چکا تھا۔ لیکن ان کی اور ان کی والدہ جو اس خدمت میں ان کے ہمراہ رہی کی کوشش سے اس سکول کو پہلے مڈل اور پھر ہائی سکول کا درجہ حاصل ہو گیا۔ بدیں وجہ اس سکول کو ان کی وفات کے بعد انہی کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔ اور آج بھی اس سکول کا یہی نام قائم ہے۔ (پینل ہائی سکول بنوں)۔

وہ کھیل کے ذریعہ بشارت دینے پر یقین رکھتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں پٹھان طلباء کی ایک ٹیم لے کر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں گئے۔ ابتدائی ایام میں اپنی خدمت کے دوران ایک ہسپتال قائم کیا جس کا نام ڈاکٹر صاحب کے نام پر رکھا گیا۔

ڈاکٹر پینل کی شہرت، شفا کی طاقت اور جذبۂ ہمدردی کی وجہ سے لوگ کابل اور غزنی سے علاج کی خاطر چلے آتے تھے۔ اُونٹوں کے کاروانوں، فرنٹیئر کی سخت زندگی، لوگوں کی مار دھاڑ، قبائلی دشمنی، انتقامی جذبات کے باعث لڑائی اور زخمیوں کی تعداد کو دیکھ وہ کبھی نہ گھبراتے تھے۔

وہ ۱۹۱۲ء تک خدمت کرتے رہے اور اسی سال ایک پٹھان کے زہریلے پھوڑے کا اپریشن کرتے کرتے خود بیمار ہو گئے اور اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

بنوں میں ان کی کامیابی کا ایک اور بھی راستہ تھا کہ DO IN ROME AS THE ROMANS DO جیسا دیس ویسا بھیس۔ اس لئے پٹھانوں کی طرح رہتے اُن کی طرح لباس زیب تن کرتے اور اُن کے ہمراہ خورد و نوش بھی کرتے۔ اُن میں اس قدر گھل مل جانے کے باوجود وہ اپنے مقصد کو کبھی نہ بھولے۔ مسیح خداوند کے نام کا پرچار کرتے رہے۔ مگر بنوں کی سخت اور سنگلاخ زمین میں بہت کم

لوگوں نے مسیح خداوند کو قبول کیا۔ لیکن بنوں کے پٹھانوں کا یہ احساس کہ ایک فرشتہ انسان ڈاکٹر پینل ان کے درمیان رہا آج بھی زندہ ہے۔ اور یہ کہ وہ زندگی بھر ان کی خدمت کرتا رہا بلکہ ان کی خاطر ان تھک محنت کرتا رہا۔

ڈاکٹر پینل بیس (۲۰) سال خدمت کرنے کے بعد بنوں میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

ان کے کفن دفن کے وقت کون سی آنکھ تھی جو بھر نہ آئی۔ کونسا دل تھا جو خون کے آنسو نہ رو رہا تھا۔ کونسا انسان تھا جو اپنی اس محرومی پر تلملا کر نہ رہ گیا تھا۔ خواہ اپنے، خواہ پرائے، پٹھان، ہندو، سکھ سب کے سب دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ بنوں ہسپتال، سکول، عالی شان محلات، گرد و نواح کے مقامات اور دور دراز کے علاقہ جات ماتم کدہ بن گئے۔ ان کے جسم کو مسیحی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

وہ غریبوں میں آیا اور ان کا بن کر ان کے درمیان سے غائب ہو گیا۔

پینل کا نام بنوں اور اس کے مضافات میں ان کی خدمت کی بدولت رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔[1]

ہنری ہالینڈ عُرف سرحدی ڈاکٹر (کوئٹہ)

۱۸۸۵ء میں کراچی اور کوئٹہ کو بذریعہ ریل ملا دیا گیا۔ اس وقت کوئٹہ صرف ایک برٹش چھاؤنی کی حیثیت سے مشہور تھا۔ آس پاس ویران اور بنجر پہاڑیاں ہوا کرتی تھیں۔

---

[1] ایس۔ جے۔ امام الدین۔ بنوں کے ڈاکٹر پینل۔ مسیحی اشاعت خانہ لاہور

ایک انگریز افسر سنڈیمن نے بلوچستان کا بڑا اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ اس کے انتظامی حُسن سلوک ہی کی وجہ سے بلوچ قبائل باہمی لڑائی یا خاندانی جھگڑوں اور قتل و غارت سے باز رہے۔ سنڈیمن ہی دراصل جدید بلوچستان کا بانی تھا۔

ڈاکٹر ڈبلیو سٹن Dr. W Sutton نے ۱۸۸۶ء میں کوئٹہ کرسچن ہسپتال کی بنیاد رکھی۔ اس کے وسیلہ پہلا شخص جو کوئٹہ میں بلوچوں میں سے مسیحی ہوا وہ عبدالکریم تھا۔ پھر نصراللہ۔

۱۹۰۰ء میں ہنری ہالینڈ HENRY HOLLAND پہلی بار کوئٹہ آیا۔ یہ خداوند کا بڑا جوشیلا خادم تھا جس نے چپل آف ہوں کی طرح بلوچستان کے لوگوں کے دل موہ لئے۔ ڈاکٹر ہنری نے کوئٹہ میں پچاس سال خدمت کی اور عبدالکریم اور نصراللہ ۱۹۰۶ء میں اُسی کے عہد میں شہید کر دیے گئے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے مسیحیت کو قبول کر لیا تھا۔ اور یہ بات بلوچوں کو پسند نہ آئی۔

ہنری ہالینڈ نے ۱۹۳۵ء کے زلزلہ سے پہلے اور بعد میں ان گنت لوگوں کی آنکھوں کا اپریشن کیا۔ وہ اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔

کہ زلزلہ مئی ۱۹۳۵ء میں رات کو تین بجے آیا اور بیس سیکنڈ تک رہا۔ کوئٹہ کی تمام عمارات اور چارگرجا گھر زمین بوس ہو گئے۔ اسی ہزار آدمی اس کی نذر ہو گئے اور ایک لاکھ زخمی ہوئے۔ ہنری ہالینڈ خود بھی ملبہ کے نیچے دب گئے۔ اُن کے بیٹے ہیری HERRY نے ہمت کر کے ان کو نکالا۔ زلزلہ کے بعد چار دن وہ سول ہسپتال میں زیر علاج رہے اور جب افاقہ ہوا تو حکومت نے انہیں چیف میڈیکل افسر بنا دیا۔ بعد میں سر SIR کا خطاب دیا۔

ڈاکٹر صاحب تحریر کرتے ہیں:۔

زلزلے کی خبر دینے والے کوئٹہ کے کتے تھے جنہوں نے آدھ گھنٹہ پہلے

خوب زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔ پھر یہ بھی لکھا کہ ایک انگریز بریگیڈیر اس کتے کی آواز سن کر باہر آیا کیونکہ وہ بہت دیر سے بھونک رہا تھا۔ اور یوں اس کی جان بچ گئی۔

۱۹۳۰ء میں انہی کے عہد میں ہسپتال میں میل نرسنگ شروع ہوئی۔ یہ پاکستان کا واحد طبی ادارہ ہے جہاں میل نرسنگ کی تربیت دی جاتی ہے۔

اس میل نرسنگ میں ایک پاکستانی مسیحی کا کردار سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ تھے فضل دین جن کی ڈاکٹر موصوف نے بھی بڑی تعریف کی۔

ڈاکٹر ہالینڈ نے اپنی زندگی میں ہندوستان کے لارڈ، گورنر اور بلوچستان کے بڑے بڑے نوابوں سے تعلقات استوار کئے اور بلوچوں میں بشارت کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہ کوئٹہ میں مقیم اپنے ساتھی ڈاکٹر سموئیل لوتھر اور محسن نتھانی اہل کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔ نتھانی اہل خاندان آج بھی کوئٹہ میں نامور خاندان ہے۔

آپ کے بیٹے ڈاکٹر رونی ہالینڈ[1] نے بھی پچاس سال تک کوئٹہ میں خدمت کی۔ اس خدمت کے دوران وہ کوئٹہ، حیدرآباد، شکارپور، زیارت، فورٹ منرو، تمام جگہوں پر جا کر مصروف خدمت رہے۔ اس خدمت کے دوران اگرچہ بلوچوں نے مسیحیت کو نہ اپنایا مگر انہوں نے مسیحیت کی بابت بہت کچھ سیکھا۔

کلیسیائے پاکستان میں شاید ایک درجن سے کم لوگ ہوں گے جنہوں نے پاکستان کے مسیحیوں اور غیر مسیحیوں کے درمیان اس قدر طویل عرصہ خدمت کی ہو۔ یہ شرف ڈاکٹر ہنری ہالینڈ اور ان کے بیٹے رونی ہالینڈ ہی کو حاصل ہے

---

[1] ڈاکٹر ہنری ہالینڈ خود نوشت سوانح عمری۔ فرنٹیئر ڈاکٹر لندن ہوڈر پریس ۱۹۵۸ء۔

"کلام حق" کے علاوہ آپ کی بے شمار تصانیف ہیں۔ چند ایک کے نام یہ ہیں۔

بائبل اٹلس و تاریخ بائبل۔ موسوی شریعت۔ عہد عتیق کی کتابوں کا دیباچہ۔ حقیقت مرزا بقلم خود۔ تصدیق الکتاب۔ اظہار الحق۔ علم الوعظ۔ صداقت بائبل۔ کلید الکلام۔ انبیائے قدیم۔ علم الٰہی کے مسائل۔ قرآن شریف کے متن کا تاریخی مطالعہ۔ بائبل مقدس اور آثار قدیمہ۔

اُن کی تصانیف ۲۰ کے لگ بھگ ہیں۔ بہر حال آپ نے نہایت اونچا مقام حاصل کیا۔ وہ کلیسیا کے عظیم راہنما تھے جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

حق پرستی کا نمونہ، حق شناسی کی مثال
ناصح شیریں نوا اور واعظ رنگیں مقال
خادمِ دیں تھا کہ جس کی مل نہیں سکتی مثال
خدمت بے لوث اس کی زندگی کا ہے کمال
(بھٹو)

کلیسیا کا یہ بطل جلیل ۷ رمئی ۱۹۹۶ء کو گوجرانوالہ میں اپنے ابدی آرام میں داخل ہوا۔

باب دہم

کلیسیا کی مُلکی خدمات

تعلیم

تعلیم وہ زیور ہے جس کی کوئی قیمت نہیں۔ نہ تو یہ چھینا جا سکتا ہے اور نہ کوئی چرا سکتا ہے۔ یہ وہ خزانہ ہے کہ استعمال کرنے سے بڑھتا ہے۔ حالانکہ دولت کو لوگ بڑی اہمیت دیتے ہیں مگر وہ استعمال سے قلت کا شکار ہو جاتی ہے۔ عہد جدید میں انہی ممالک نے ترقی کے زینے طے کیے جنہوں نے تعلیم کو ترجیح دی۔ حالی نے اپنی ایک رباعی میں علم سے مخاطب ہو کر اس کی تعریف یوں کی ہے۔

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال
غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
ان پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال (اصل سرمایہ)

ایک بین الاقوامی کانفرنس میں کسی نے دریافت کیا کہ کیا راز ہے کہ آج تک جتنے نوبل پرائز دیے گئے ان میں سے اسی فیصد یہودیوں نے حاصل کیے۔ نیز دور موجودہ وقت میں سب پر سبقت لے گئے ہیں۔ جواب تو بے شمار اور مختلف تھے مگر ایک مستند جواب ملا۔ تعلیم حاصل کرنا ہر یہودی کا فرض اولین ہے کیونکہ اس کا جواب یہ انگریزی مقولہ ہے

NO NATION WITHOUT EDUCATION

ہندوپاکستان کی دھرتی پر تعلیم کے سلسلہ میں جو خدمات مسیحی لوگوں نے ادا کی ہیں ان کی مثال فراہم کرنا کسی طور بھی ممکن نہیں۔ دوسرے مذاہب اور اقوام

نے بھی تعلیم دینے میں کردار ادا کیا ہے اور اس کے لئے جد و جہد اور تگ و دو کی۔

تھامے اور ... جہاں تک کلیسا کے کردار کی بات ہے وہ محض مذہبی ہی نہیں بلکہ دور رس ... کی مثال دینا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

ولیم ولبرفورس نے لارڈ میکالے کو ساتھ لے کر ہندوستان میں انگریزی تعلیم دینے کا قانون بنایا اور راجہ رام موہن رائے کو بھی ساتھ ملایا۔ بعد میں سر سید احمد خان کی کوشش کو بھی سراہنے اور یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انہوں نے مذہبی اعتراض اور رکاوٹ کے باوجود انگریزی تعلیم کے اجراء کے لئے کافی جد و جہد کی۔

کلیسا نے ملک بھر میں کالج اور اسکول کھول دیئے۔ انہی سکولوں نے وہ کارنامہ سر انجام دیا کہ پاکستان کی بڑی بڑی ہستیاں اور نامور شخصیات انہی سکولوں کی تعلیم یافتہ ہیں۔ علمی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے رومن کیتھولک (فرقہ) کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان خدمات کی کارکردگی سب پر عیاں ہے۔

۱۔ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے سی۔ ایم۔ ایس سکول کراچی سے میٹرک کا امتحان پاس نہیں کیا تھا۔ صرف کچھ عرصہ وہاں زیر تعلیم رہے تھے۔

۲۔ مفکر پاکستان یعنی شاعر مشرق علامہ اقبال سکاچ مشن ہائی سکول اور مرے کالج سیالکوٹ میں زیر تعلیم رہے۔

۳۔ جنرل ضیاء الحق (صدر پاکستان) سینٹ سٹیفن کالج دہلی کے طالب علم تھے۔

۴۔ محترمہ بےنظیر بھٹو نے (سابق وزیر اعظم پاکستان) سینٹ میری سکول کراچی سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔

۵۔ نواز شریف (سابق وزیر اعظم پاکستان) سینٹ انتھونی سکول لاہور کے تعلیم یافتہ ہیں۔

۶۔ سابق چیف جسٹس پاکستان اور بلند پایہ قانون دان اے۔ آر کارنیلیس نے بھی سینٹ انتھونی سکول سے میٹرک کیا۔

۷۔ سابق چیف جسٹس پاکستان نسیم حسن شاہ کیتھیڈرل سکول ہال روڈ کے طالب علم تھے۔

علاوہ ازیں ایڈورڈ کالج، مرے کالج، گارڈن کالج، ایف۔ سی کالج اور کینیئرڈ کالج نے پاکستان کی تعمیر و ترقی میں جو خدمات سرانجام دیں وہ دن کے اجالے کی طرح ہر کسی پر واضح ہیں۔

قائداعظم نے نئی دہلی میں ۱۳ر جولائی ۱۹۴۷ء کو اپنی تقریر میں فرمایا[1]۔

پاکستان میں اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔ ان کے مذہب عقیدہ، جان و مال اور ان کی ثقافت کا مناسب تحفظ ہو گا۔ وہ بلا لحاظ رنگ و نسل ہر اعتبار سے پاکستان کے شہری ہوں گے۔

ایک اور جگہ ان کا بیان قابل تعریف ہے[2]۔

'' آپ ہمیں حیوان نہ سمجھیں۔ یاد رکھئے کہ مسلمان اپنی اقلیتوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک روا رکھیں گے۔'' (غیر ملکی اخباری نمائندوں سے ملاقات ۱۴ر نومبر ۱۹۴۶ء)۔

بعد میں جن لوگوں نے اقتدار سنبھالا انہوں نے قائداعظم کے ارشادات

۱۔ سردار مسیح گل۔ نظریہ پاکستان اور اقلیتیں (ارشادات قائداعظم)

۲۔ تجلی میڈیا فاؤنڈیشن لاہور۔ صفحہ ۲۷۸۔۲۷۹، ۱۹۹۳ء

کی یہ قدر کی کہ ستمبر ۱۹۷۲ء میں صرف پنجاب میں چھپن اردو میڈیم اسکول اور چار کالج قومیا لئے گئے۔ مزید قابل افسوس بات یہ ہے کہ ان اداروں کا تشخص بگاڑ ڈالا۔

حالانکہ مسیحی عوام نے ایک خاص جذبہ اور عقیدت کے تحت ذوالفقار علی بھٹو کو ووٹ دے کر پیپلز پارٹی کو کامیاب بنایا۔ لیکن مولانا کوثر نیازی کی کتاب (آئینہ تثلیث) میں مرقوم الفاظ کے مطابق "اگر مسیحیوں کے سکول اور ادارے قومیا لئے جائیں تو یہ اپنی موت خود مر جائیں گے"۔ بے سہارا اور خدمتگار کمیونٹی کے ساتھ غیروں بلکہ سوتیلوں جیسا سلوک کیا گیا۔ مسیحیوں کی جانب سے لاہور اور راولپنڈی کی سڑکوں پر سخت احتجاج کیا گیا۔ نتیجتاً جیمس اور نواز کو گولیوں سے اُڑا دیا گیا اور کئی خواتین کی بے حرمتی کی گئی۔ اداروں کی پراپرٹی پر غاصبانہ قبضہ کر لیا گیا۔ وعدوں کے باوجود مسیحی انتظامیہ کو تبدیل کر دیا گیا۔ سپریم کورٹ میں ایف۔ سی کالج اور مشن ہائی سکول رنگ محل کا مقدمہ جیتنے کے باوجود نہ پراپرٹی کو چرچ کی پراپرٹی سمجھا گیا اور نہ ہی کرایہ کی ادائیگی کی طرف توجہ دی گئی۔

جونیجو حکومت کا خوش آئند قدم یہ تھا کہ مسیحی سکول اور کالج واپس کر دیئے جائیں جو پنجاب اور سندھ میں قومیائے گئے تھے۔ مگر پنجاب گورنمنٹ نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے یہ بات نہ ہونے دی۔ سندھ میں کچھ ادارے واپس کر دیئے گئے ہیں۔ بلوچستان اور سرحد میں سکول قومیائے ہی نہیں گئے تھے۔

جن اداروں کو قومیا لیا گیا تھا آج وہاں دیواریں سلامت ہیں نہ فرنیچر اور نہ ہی درس و تدریس کا سلسلہ اور نہ تعلیم کا معیار۔ تمام سکولوں اور کالجوں میں ان تمام سلاسل کا ستیاناس کر دیا گیا۔ افسوس سے یہ کہنا پڑے گا کہ

کیا اس لئے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے

کہ بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

ان الفاظ کو دہرانا بہت ہی مناسب ہو گا کہ مسیحیوں کو آج نہ کسی نصاب تشکیل کرنے والی کمیٹی میں لیا جاتا ہے اور نہ ہی صلاح و مشورہ کے لئے شامل کیا جاتا ہے۔ مسیحیوں کی خدمات کا کہیں ذکر تک نہیں کیا جاتا۔ اس پر طرفہ یہ کہ مسلمان بچوں کو اسلامیات پڑھائی جاتی ہے مگر مسیحی بچوں کے لئے مسیحی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔ ہماری عرضداشتوں کو صدا بصحرا سمجھ کر خاطر میں نہیں لایا جاتا۔

یہ بات انتہائی دکھ سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ ادارے جنہوں نے اس ملک کی تعلیم۔ سیاست، کھیل، سائنس، قانون اور کئی شعبوں میں بیش بہا خدمت کی۔ قوم کا اخلاق سنوارا، سماج کو سنبھالا، اُن کے ساتھ اس قسم کا سلوک۔ ایسا سلوک قائداعظم کے فرمودات سے روگردانی ہے۔

مسیحی اداروں کو غاصبانہ طور پر چھین کر قومیایا گیا ہے۔ ان کے کام پر بھی برکت نہیں ہوگی۔ کیونکہ یہ ادارے ہم نے چندہ اکٹھا کر کے بنائے تھے۔ آج ان کے ساخت اور نام تک تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔ جن لوگوں کے ناموں کی پلیٹیں لگا دی گئی ہیں اُن کی اپنی روحیں اس فعل کو دیکھ کر بھی خوشی حاصل نہیں کر سکتیں۔ ہم کس کے سامنے اپنی داد اور رونا پیش کریں؟

ع کوئی پُرسانِ حال ہو تو کہیں

ان قومیائے گئے اداروں اور موجودہ کلیسیائی اداروں میں عظیم ہستیوں نے خدمات انجام دی ہیں۔ معدودے چند کے سوا باقی تمام راہئ ملک عدم ہو چکے ہیں۔ اُن ہستیوں کا اگر ذکر نہ کیا جائے تو سراسر ناانصافی ہوگی۔ یہ ہستیاں ماہرین

لے (Yusuf Wahab - Achievements and Set backs - A Serving Community - Lahore page 18

تعلیم بدیسی بھی ہیں اور پاکستانی بھی۔

صوبہ پنجاب کے کالجوں اور سکولوں میں۔ سٹوارٹ، کنگز، ایم۔ اے۔ کیوڈ سکوی، سکاٹ، فرینک خیر اللہ، یونگ، سکلیر، مس منگت رائے، مس نجم الدین، وکٹرمل، مسز فیلہوس، فرانسس زیویر، فاسٹر، رلیارام، عرفان، موتی لال، منوہر لعل، یوسف وہاب، پری مائیکل، ولیم کے مل، ایم۔ اے۔ کیزلر۔ (پنجاب)

صوبہ سندھ میں:۔ فادر ریمنڈ۔ سندرداس۔ ٹونی لوبو۔

سرحد میں:۔ ایڈمنڈ اور جلال الدین۔ سکول کی سطح پر بحیثیت منتظمین ہیڈ یادر ہیں گے۔

۱۴ر ستمبر ۱۹۹۳ء روز نامہ پاکستان لاہور میں عابد قریشی پرنسپل ایف۔ سی کالج کا ایک بیان ملاحظہ ہو۔ جس میں اس بات کا اقرار ہے کہ سابق انتظامیہ کے تحت ایف۔ سی کالج جہاں ایک معیاری ادارہ ہوا کرتا تھا۔ اُس کا معیار اس حد تک گر گیا ہے کہ اب ماحول یکسر بدل گیا ہے۔ نہ سکولوں نہ ہی کالجوں میں وہ ماحول رہا ہے، نہ اُستادوں کو کوئی سلیقہ ہے۔ انہوں نے یہ بھی اقرار کیا کہ آج یہ کالج سرکاری ادارہ بھی مشنری اداروں جیسا نہ تو ماحول پیدا کر سکا ہے نہ معیار تعلیم اور نہ ہی نظم وضبط۔

طب

گذشتہ ایک صدی میں طبی اداروں اور ان کی خدمات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے میموریل کرسچن ہسپتال سیالکوٹ کو سرفہرست رکھنا ہوگا جو ۱۸۸۶ء میں قائم کیا گیا تھا۔

راولپنڈی میں ہولی فیملی ہسپتال اور دارالخلو کوڑھیوں کا ہسپتال ۱۹۰۰ء میں کھولے گئے۔ جن میں ۹۵% کوڑھی مسلم مریض ہوتے ہیں۔ کوئٹہ

کرسچن ہسپتال امراض چشم کا سب سے پہلا ہسپتال ہے۔ اس کی خصوصیت یہ بھی ہے

کہ میل نرسنگ کی تربیت کے لئے ملک میں واحد ادارہ ہے۔ علاوہ ازیں بنوں میں

پنیل ہسپتال، پشاور میں کرسچن ہسپتال، ڈیرہ ٹانک، ساہیوال، کنری، ایس۔

وی۔اے کراچی، باغ ہسپتال مانسہرہ، کرسچن ہسپتال ٹیکسلا، یو۔ سی۔ ایچ لاہور

اور ٹیلوخ ہسپتال جلال پور جٹاں میں مصروف عمل ہیں۔

پشاور کرسچن ہسپتال میں تین شعبے ہیں۔ جذام، امراض چشم اور ذہنی

امراض۔

یو۔سی۔ ایچ اگرچہ کم عمر ہے لیکن یہاں پاکستان میں دل کا پہلا اپریشن

ہوا۔

ٹیکسلا کرسچن ہسپتال میں سال بھر میں دس ہزار مریضوں کا اپریشن کیا جاتا

ہے۔

ان ہسپتالوں میں ماریا وایف سیالکوٹ۔ ڈبلیو سٹن، ہنری ہالینڈ کوئٹہ۔

آرتھر لنکاسٹر۔ انورا جاگر اور ہیرلڈ سٹار پشاور (ہیرلڈ سٹار کو ۱۹۱۰ء میں

ایک پٹھان نے رات کو قتل کر دیا تھا)۔

جے مارٹن اور ارنسٹ لال (ٹیکسلا) رائس بوعز بینجمن، سموئیل نواب

(یو۔سی۔ ایچ) لاہور

پنیل اور قدوس (بنوں) گرانقدر خدمات کے لئے یاد رہیں گے۔

اس وقت ملک میں چھوٹے بڑے ساٹھ کے قریب ہسپتال صرف کلیسیائی انتظام کے

تحت چل رہے ہیں۔

آرٹ اور فن

آرٹ اور فن میں مسیحیوں کی خدمات قابل تحسین ہیں۔ سلیم رضا نے فلم

انڈسٹری میں ایک طویل عرصہ بطور ایک قابل فخر گائیک کے گزارا، ۱۹۶۵ء تک
اپنی سحر انگیز آواز کا جادو جگائے رکھا۔ ہر گانا جو اس نے گایا مسحور کن، دلفریب،
دلکش اور دل میں جاگزیں رہنے والا تھا۔ اس کے یہ گانے آج بھی زبان
زد خاص و عام ہیں۔

یارو مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں۔

زندگی میں ایک پل بھی چین آوے نہ

میرے دل کی انجمن میں تیرے دم سے روشنی ہے۔

جان بہاراں رشک چمن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اے دل کسی کی یاد میں ہوتا ہے بیقرار کیوں

ایس۔ بی جان کے اس گانے نے دھوم مچادی۔ یہاں تک کہ انڈین فلم
انڈسٹری نے اُسے انڈیا آنے کی دعوت دی۔

تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

یہ مانا کہ محفل جواں ہے حسین ہے

(فلم سویرا)

آئرین پروین نے بھی شہرت کی بلندیوں کو چھوا مگر گھریلو مسائل نے اُسے
انڈسٹری کو خیر باد کہنے پر مجبور کر دیا۔

اے نیّر کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو کشور کمار یاد آ جاتا ہے۔

بنجمن سسٹرز کا منفرد انداز آج بھی لاثانی ہے۔

روبن گھوش اور سی تھاکرداس ہمارے ملک کے عظیم میوزک ڈائریکٹر ہیں
اور عرصہ دراز سے اپنی اس خدمت میں پیش پیش ہیں۔

نیلو، شبنم، سنتوش رسل، روزینہ اور چیا و کنز اداکاری کے جوہر دکھا رہی

شبنم تیس سالوں سے فلم انڈسٹری پر چھائی ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ موہنی حمید۔ ایڈورڈ ملیر ، وکٹر ولیم۔ نسرین انجم بھٹی مانے ہوئے ریڈیو اور ٹی۔ وی اناؤنسر تھے۔ ارنسٹ ٹھاکر داس ، سوئیکل اشفاق ، ایس۔ پی۔ ل ، ڈینس آئزک اور آشر عظیم پروگرام پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار مشہور ہوئے۔

انور ارنسٹ ٹی وی کے ایک مشہور کیمرہ مین ہیں۔

انور صدیق پال مشہور چیف انجینئر ہیں۔

سیاست

پاکستان کے مسیحی سیاست کے میدان میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ قائداعظم نے پاکستان کی اقلیت کو قیام پاکستان کے سلسلہ میں اپنے ہمراہ رکھا اور پاکستان کے مسیحیوں نے بھرپور کردار ادا کیا۔ ہمارے نمائندگان دیوان بہادر ایس۔ پی سنگھا۔ سپیکر پنجاب اسمبلی ، بی۔ ایل رلیارام۔ چوہدری چندولعل سابق ڈپٹی سپیکر ، سی۔ ای گبن۔ ماسٹر فضل الہی جیسی شخصیات نے قیام پاکستان کی تائید اور حمایت کی۔

پاکستان ایک جمہوری سیاسی ریاست کی حیثیت سے وجود میں آیا جس میں مذہبی عنصر بھی موجود تھا۔ کئی مذہبی اقلیتیں بھی پاکستان کو ورثہ میں ملیں اور آج جھنڈے میں سفید حصہ اقلیت کا امتیازی نشان ہے۔

بڑی بڑی ہستیاں جن کے وسیلہ سے پاکستان بنا وہ مسیحی اداروں کی فارغ التحصیل ہی ہیں۔ اس کے باوجود آج پاکستان میں اقلیتوں کو جن میں مسیحی سب سے بڑی اقلیت ہیں دوسرے درجہ کا شہری گنا جارہا ہے۔ نہ اُن کی کوئی آواز ہے ، نہ حیثیت ، نہ کسی قومی اور ملکی سطح پر کوئی ان کا حصہ۔ قومی تہواروں اور ملکی تقریبات میں شاید ہی کوئی مسیحی ہو جس کو مدعو کیا جاتا ہے۔ قومی یک جہتی کے دھارے میں اقلیتوں کو شروع ہی سے دانستہ یا نادانستہ طور پر کوئی فعال کردار ادا نہیں کرنے دیا جارہا۔

۱۹۸۵ء میں جنرل ضیاء الحق کے دور میں مسیحیوں کو قومی دھارے سے الگ کر کے جداگانہ طریق انتخاب رائج کیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بشیر مسیح بلوچستان اسمبلی میں ڈپٹی سپیکر رہے اور جے سالک وفاقی وزیر بہبود آبادی بنے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسیحیوں کو پاکستان میں برابر کا شہری نہیں سمجھا جاتا۔

قائداعظم نے لاہور میں ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

''اسلام تمام مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ بلا لحاظ مذہب و نسل اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کی حفاظت کریں۔''

فوج اور سول

چونکہ پاکستان اور بھارت دونوں ہمسایہ ممالک ہیں اس لئے اکثر چپقلش اور جھڑپیں ممکن ہیں۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں بھی دو بڑی خونریز جنگیں لڑی گئیں۔ ان جنگوں میں بری، فضائی اور بحری افواج کے مسیحیوں کی قربانیاں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھی جائیں گی۔ ہزارہا مسیحی نوجوانوں نے پاکستان کی سرزمین کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں نثار کر دیں۔

ا۔ لاہور کے سسل چوہدری (گروپ کیپٹن) کو فضائی حملوں میں جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کرنے پر ستارہ جرأت اور تمغۂ بسالت سے نوازا گیا۔

ب۔ ایئر کموڈور نذیر لطیف کو بھی ستارۂ جرأت اور ستارہ بسالت دیا گیا۔

ج۔ ایرک۔ جی۔ ہال اور مائیکل او برین دونوں پاکستان فضائیہ کے ایئر وائس مارشل بنے۔ ان دونوں نے یکے بعد دیگرے ڈپٹی چیف کی حیثیت سے کام کیا۔

د۔ سکوارڈرن لیڈر پیٹرکرسٹی ۱۹۷۱ء اور ونگ کمانڈر مارون مڈل کورٹ ۱۹۶۵ء کی جنگوں میں شہید ہوئے۔

ر۔ بہت دیر پہلے نووین فضل الٰہی راولپنڈی NOVEN FAZAL ELAHI کا ایک زبردست ہواباز تھا۔ یہ اسی کا کارنامہ تھا کہ وہ دو دفعہ اپنا جہاز اٹک پل کے نیچے سے نکال لے گیا۔ تیسری دفعہ حکم کی بجا آوری اور کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا اور جان بحق ہوگیا۔

س۔ بحریہ میں مونٹ گیون وائس ایڈمرل کے عہدہ تک پہنچے۔ اور بیشمار بہت ہیں جن کا ذکر کرنا اگر رہ جائے تو اس کو انسانی کمزوری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

جاوید جولین پٹیر

کلیسیائی ہسٹری میں یہ بات یاد رکھی جائے گی کہ یہ قابل فوجی افسر گورڈن کالج کے فارغ التحصیل ہیں۔ اور پہلے مسیحی ہیں جن کو ۲۲ رجون ۱۹۹۳ء کو میجر جنرل کے عہدہ پر ترقی دے کر اوکاڑہ میں G.O.C. مقرر کیا گیا ہے۔

جوشوا فضل دین

تمغۂ امتیاز برائے پنجابی ادب۔ سابق نائب وزیر خزانہ و قانون مغربی پاکستان لاہور۔

(سول) اے۔ آر۔ کرنیلیس

پاکستان سول سروس میں بہت کم مسیحیوں نے ایسے اونچے درجہ تک رسائی حاصل کی۔ ایک خاص ہستی جس کا ذکر کرنے میں فخر محسوس کروں گا۔ وہ

تھے۔اے۔آر۔کرنیلیس جو ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۸ء تک پاکستان سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہے۔ اور ۱۹۶۹ء میں وزیر قانون بھی رہے۔ لیکن صد افسوس کہ ۱۹۹۱ء میں ایک طویل علالت کے بعد یہ قابل فخر انسان اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔ اُن کی قبر جیل روڈ گورا قبرستان میں واقع ہے۔

کلیسیا موجودہ دور میں

اگر موجودہ دور میں کلیسیا پر نظر ڈالی جائے تو کلیسیا کے اُن حالات پر نظر پڑتی ہے جن کے چشم دید گواہ افراد ابھی تک حیات ہیں۔ اُن کی تعداد کم وبیش بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن حالات و واقعات زیادہ تر اسی بیسویں صدی کے اور قیام پاکستان کے عہد کے ہیں۔ ان پر طائرانہ نظر ڈالنا اچھا رہے گا۔

۱۔ کوئٹہ کا زلزلہ

۱۹۳۵ء میں ایک ہولناک زلزلہ آیا جس کا تفصیلی ذکر باب نہم حصہ دوم میں آ چکا ہے۔ یہ زلزلہ موت بن کر اسی ہزار نفوس پر سے گزر گیا۔ ایک لاکھ زخمی ہو گئے۔ جن میں سے اکثر معذور ہو کر رہ گئے۔ زندہ تو رہے مگر زندگی کی مایوسی نے انہیں ہر موڑ پر ناکارہ کر کے رکھ دیا۔ مسیحیوں پر بھی یہ قیامت گزری۔ کوئٹہ کے چاروں گرجا گھر زمین بوس ہو گئے۔

۲۔ قیام پاکستان

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ اس دھرتی کے مسیحی نمائندوں نے قائد اعظم کے ساتھ مل کر پاکستان کو وجود میں لانے کے لئے ووٹ اُن کے حق میں دے دیا۔

۳۔ متہ کا سانحہ ۱۹۵۲ء

متہ MATA رائیونڈ سے تقریباً آٹھ میل جنوبی سمت ایک چھوٹا سا گاؤں

تھا۔ جہاں چند ایک مسیحی خاندان آباد تھے۔ کسی معمولی تنازعہ کی بنا پر غیر مسیحیوں سے رنجش ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سات مسیحی افراد کو ایک کچے مکان میں بند کر کے زندہ جلا کر وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا گیا۔ لیکن ہمارا ایمان یہ ہے کہ خداوند ہر جگہ موجود ہے اور آج بلکہ ہمیشہ تک اپنے لوگوں کے ساتھ ہے۔

سی۔ ای۔ کمیشن نے اس سلسلہ میں بڑا زبردست موقف اختیار کیا۔ مقدمہ کی پیروی کی اور تمام شرپسندوں اور واقعہ کے ذمہ دار افراد کو پھانسی دلوائی۔

۴۔ پاک و ہند کے مابین جنگیں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء

تاریخ گواہ ہے کہ قیام پاکستان سے آج تک ایک مسیحی بھی جاسوس نہیں نکلا۔ لیکن مذکورہ دونوں جنگوں میں چند مسیحیوں کو اس بے جا الزام میں گرفتار کر کے اذیت پہنچائی گئی۔ نارووال کے پادری نعمت مسیح کو گرم پلیٹ پر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ اس کا قصور یہی تھا کہ اس نے کوئی قصور نہ کیا تھا۔ ان دونوں جنگوں میں مسیحیوں کو خاص کر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مشکوک نظروں سے دیکھا گیا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ میں بدیسی مشنریوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اور یوں کلیسیا کو اس سہولت سے جو مشنریوں کی معرفت حاصل تھی محروم کر دیا گیا۔ لیکن شکر ہے کہ کلیسیا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھ گئی ہے۔

۵۔ مارٹن پور کا واقعہ نومبر ۱۹۶۷ء

مارٹن پور کے ہائی سکول کی دیوار پر کچھ ایسی تحریر پائی گئی جس سے اڑوس پڑوس کے چودہ مسلم گاؤں مشتعل ہو گئے۔ حالانکہ گاؤں والوں نے یقین دلایا کہ اس تحریر سے ہمارا کوئی سروکار نہیں۔ لیکن انہوں نے اس دیہات پر حملہ کر دیا۔ مارٹن پور اور ینگسن آباد کے مسیحیوں نے جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ گرجا گھر اور

جانوں کی حفاظت کی۔ ایک جواں ہمت پرویز پال مرحوم کی کوشش کو فراموش نہیں کیا
جا سکتا۔ جس نے رکشہ میں سوار ہو کر بروقت ننکانہ پولیس چوکی میں خبر کر کے ایک
بڑے خون خرابے سے بچا لیا۔

۶۔ چرچ آف پاکستان کی تشکیل ۱۹۷۰ء

یکم نومبر آل سینٹس ڈے (یوم مقدسین) کے موقع پر پاکستان کی چار کلیسیاؤں نے ایک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس طرح چرچ آف پاکستان کی ابتدا ہوئی۔ ان چار کلیسیاؤں کے نام یہ ہیں۔ اینگلیکن۔ میتھوڈسٹ۔ سیالکوٹ چرچ کونسل اور لوتھرن چرچ۔

بشپ عنایت مسیح، لاہور۔ بشپ ولیم ینگ سیالکوٹ۔ بشپ جے۔ وی سموئیل ملتان۔ بشپ ارنی روڈون لوتھرن سرحد سے اور پادری ایڈگر ہانٹ سمتھ پہلے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے اس چرچ یونین کے روح رواں تھے۔

دعا ہے کہ خداوند اس اتحاد کو قائم و دائم رکھے۔ آمین

۷۔ مسیحی تعلیمی اداروں کا قومیایا جانا ۱۹۷۲ء

بھٹو حکومت نے یکم ستمبر ۱۹۷۲ء کو پنجاب بھر کے بیشتر مسیحی ہائی سکول اور چار کالجوں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ یہ دن پاکستانی کلیسیا کے لئے یوم سیاہ تھا۔ مسیحیوں نے پنجاب کے بڑے بڑے شہروں خاص کر لاہور اور راولپنڈی میں بہت واویلا کیا۔ ماتمی جلوس نکالے۔ جلسے منعقد کئے۔ راولپنڈی میں گورنر ہاؤس کے قریب دو مسیحیوں جیمس JAMES اور نواز کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔

سندھ میں بھی بیشتر اداروں کے ساتھ یہی کیا گیا۔ لیکن بعد ازاں کچھ ادارے کلیسیائی انتظامیہ کو واپس کر دیے گئے۔ سرحد اور بلوچستان میں کوئی مسیحی

ادارہ نہ لیا گیا۔ لیکن یہ بات نہایت قابل افسوس ہے کہ آج کل ایڈورڈ کالج کا زیادہ تر انتظام سرحد حکومت کے ہاتھ میں ہے۔

خداوند زندہ ہے اور اپنے لوگوں کی مظلومیت کو دیکھتا ہے۔ اس حوصلہ شکن اقدام کا انجام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔

۸۔ اتوار کی چھٹی کا ختم ہونا ۱۹۷۷ء

ذوالفقار علی بھٹو ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۷ء تک اقتدار میں رہے۔ اُن کے دور میں مسیحی تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں انہوں نے اتوار کی چھٹی منسوخ کر دی۔ لیکن اس کے بعد اقتدار اُن کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ اتوار کی چھٹی کا منسوخ ہونا مسیحیوں کے مذہب میں مداخلت تھا۔ آج ہر کس و ناکس کو علم ہے کہ اتوار کی بجائے جمعہ کی چھٹی کی وجہ سے ملک کو بین الاقوامی سطح پر کس قدر نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ نواز شریف حکومت نے اتوار کی چھٹی بحال کر دی۔

۹۔ خانہ کعبہ پر حملہ، نومبر ۱۹۷۹ء

سعودی عرب میں چند شرپسندوں نے کعبہ کے اندر گھس کر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان میں چند اوباش لوگوں نے اسے امریکی سازش قرار دے کر گرجا گھروں اور مسیحی اداروں کا گھیراؤ کر لیا۔ گرجا گھر جلائے گئے۔ مسیحیوں کو بعض جگہ ستایا گیا۔ لیکن جنرل ضیاء الحق کی بروقت مداخلت اور ٹی۔ وی پر اعلان کی بدولت مسیحی عوام محفوظ ہو گئے۔ جنرل ضیاء نے راولپنڈی شہر کی ایک تقریب میں

دوران تقریر یہ کہا۔ ۱؎

"یہ چند غیر ذمہ دار لوگوں کی غیر ذمہ دارانہ حرکت تھی۔ لیکن حکومت ایسے کاموں کی سختی سے مذمت کرتی ہے۔"

۱۰۔ جداگانہ طریق انتخاب ۱۹۷۵ء

اس سال جنرل ضیاء الحق کے دور میں مسیحیوں کو قومی دھارے سے الگ کر کے جداگانہ طریق انتخاب رائج کیا گیا۔ اس طریق انتخاب سے مسیحی بالکل ایک علیحدہ نسل اور مذہب تصور کیے جانے لگے۔ آج انہیں دوسرے درجہ کا شہری مانا جاتا ہے۔ ان کا کوئی قومی تشخص نہیں اور نہ ہی کوئی پہچان ہے۔ یوں مسیحی بالکل الگ تھلگ ہو کر رہ گئے ہیں۔

۱۱۔ رحیم یار خاں میں چرچ کی توڑ پھوڑ ۱۹۷۶ء

۱۹۷۶ء میں رحیم یار خاں رومن کیتھولک چرچ میں چند لوگوں نے صرف مذہبی بنا پر گرجا گھر اور لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ مشتعل طلبا اور غنڈوں نے ایک سکول میں گھس کر مسیحی طلبا اور اساتذہ کو زدوکوب کیا۔ صلیب، بائبل مقدس اور پاک ظروف کی بے حرمتی کی۔ مسیحیوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ لاہور اور دیگر جگہوں پر مظاہرے بھی کیے گئے۔

۱۲۔ شناختی کارڈ کا مسئلہ ۱۹۹۲ء

ملک میں شریعت بل اور اسلامی قانون تو رائج ہو چکا ہے۔ لیکن اس ملک

۱؎ جنرل ضیاء نے یہ الفاظ راولپنڈی میڈیکل کالج میں ایک ڈنر کے موقع پر کہے۔ اس کا اہتمام مسیحی طلبا اور طالبات نے کیا تھا۔ (دسمبر ۱۹۷۹ء)

میں جہاں قائد اعظم کے قول کے مطابق اقلیتوں کی حفاظت کو ایک مذہبی اور قومی فریضہ سمجھا گیا تھا۔ چند انتہا پسند لوگوں نے چاہا کہ شناختی کارڈ میں ایک مذہبی خانہ بنایا جائے۔ اس فعل کا مقصد یہ تھا کہ شناختی کارڈ میں تمام اقلیتوں کی پاکستانی نہیں بلکہ مذہب کے لحاظ سے شناخت کروائی جائے۔ مسیحی قوم جاگ اٹھی اور اسے نامنظور کرتے ہوئے زبردست احتجاجی سلسلہ شروع کیا۔ پاکستان بھر میں اس امر کے خلاف آواز بلند کی۔ کلیسیائی طور پر یہ پہلا موقع تھا جب تمام کلیسیائیں، رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ قیادت، ہماری اسمبلیوں کے قومی اور صوبائی نمائندگان اکٹھے ہوئے۔ مسیحی عوام سڑکوں پر نکل آئے اور ۲۵ر دسمبر ۱۹۹۲ء یعنی کرسمس کے مقدس تہوار کے دن پاکستان بھر کے تمام اخبارات میں یہ اعلان کیا گیا کہ شناختی کارڈ میں مذہبی خانہ ختم کر دیا گیا ہے۔ پاکستان کے مسیحی عوام کی خواہشات اور ضرورت کی یہ ایک زبردست فتح تھی کیونکہ پاکستانی عوام کو تحفظ کے ساتھ اپنائیت کا احساس چاہیے۔ یہ اسی ملک کے باسی ہیں، پاکستانی ہیں، یہیں کی پیداوار ہیں اور یہیں مرنا ہے۔

۱۳۔ دو پریسبیٹرین کلیسیاؤں کا اتحاد ۲۰ر نومبر ۱۹۹۲ء

یہ بات نہایت خوش آئند ہے کہ ۲۰ر نومبر ۱۹۹۲ء کو دو سب سے پرانی کلیسیائیں متحد ہوئیں جن کے پہلے مشنری چارلس فورمین اور اینڈریو گورڈن تھے۔ یہ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۵ء میں لاہور اور سیالکوٹ آئے تھے۔ دونوں نے امریکن اور یونائیٹڈ پریسبیٹرین کلیسیاؤں کی بنیاد رکھی۔ ان دونوں کلیسیاؤں نے نولکھا چرچ نکلسن روڈ لاہور میں عہد کیا کہ ان دونوں کلیسیاؤں کو ایک ہی نام دے کر کلیسیا بنایا جائے۔ چنانچہ نیا نام پریسبیٹرین چرچ آف پاکستان رکھا گیا۔ یہ ۱۹۷۰ء کے بعد دوسرا کلیسیائی اتحاد تھا۔

خداوند اس اتحاد کو بابرکت بنائے۔

۱۴۔ بشپ آف پشاور کا اغوا دسمبر ۱۹۹۲ء

چرچ آف پاکستان کی (پروٹسٹنٹ) تادم تحریر آٹھ ڈایوسیس ہیں۔ اور آٹھ بشپ ہیں۔ ماہ دسمبر ۱۹۹۲ء میں ایک اندوہناک واقعہ پیش آیا۔ پشاور کے معمر رسیدہ بشپ جو اس وقت صاحب فراش تھے اپنے گھر واقع سرسید روڈ پشاور کینٹ میں موجود تھے۔ چند غنڈوں نے رات کی تاریکی میں گھر پہنچ کر انہیں باہر بلایا۔ بشپ ایس۔ ایل الیگزینڈر باہر آئے۔ غنڈوں نے انہیں گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔ وہ اس وقت ننگے پاؤں تھے اور ایک سرد خنک رات۔ انہیں دور دراز علاقہ میں لے جایا گیا۔ تین دن تک محبوس رہے۔ ان پر سخت پہرا لگایا گیا۔ پاکستان کی تمام کلیسیا کے لئے اور خاص طور پر ان کے خاندان پر یہ ایام بڑے اذیت ناک گزرے۔ سرحد پولیس اور احکام اعلیٰ نے سب اطراف میں ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ لیکن عقلمندوں کا کہنا ہے کہ سیاہ بادلوں میں سفید لائن ضرور ہوتی ہے۔ تین دن سخت کرب میں گزارنے کے بعد رات کی تاریکی میں ایک رکشہ بشپ صاحب کو خود ہی ان کے گھر چھوڑ گیا۔ اس طرح یہ ڈرامہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ اغوا کنندہ کون تھے؟ کہاں سے تعلق تھا؟ آج تک یہ معمہ حل نہیں ہو سکا۔

۱۵۔ انسانی حقوق کا عالمی منشور اور شریعت بل

اقوام متحدہ کی بنیاد ۱۶/ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو دوسری جنگ کے خاتمہ پر رکھی گئی۔ تیس شقوں پر مشتمل انسانی حقوق کی بحالی کا عالمی منشور مرتب کیا گیا۔ تمام انسانوں کے لئے برابر اور مساوی حقوق کو یقینی بنانے پر زور دیا گیا۔

پاکستان چونکہ اقوام متحدہ کا باقاعدہ رکن ہے۔ اس لئے ہمارا ملک اصولی طور پر انسانی حقوق کا پابند ہے۔ لیکن آج تک کے حالات و واقعات کا بنظر عمیق

مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستانی اقلیتیں اس خطہ میں سخت اذیت اور پریشانی کا شکار ہیں۔

انہیں آج بھی ادنٰی درجہ کے انسان گردانا جاتا ہے۔ مذہب کی آڑ میں چند قانون بنا کر اقلیتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا ہے اسے دیکھ کر یہ احساس پیدا ہونا قدرتی امر ہے کہ بنیاد پرستی کی بنا پر اقلیتوں پر آزادی کے دروازے بند ہیں۔ ایسے قانون وضع کئے گئے ہیں جو عالمی منشور کی نفی کرتے ہیں۔

پاکستان کی تعزیرات دفعہ B ۲۹۵ کے مطابق قرآن مجید کے نسخوں کی بے حرمتی کرنے والے کے لئے عمر قید کی سزا ہے۔ ۲۹۵C گستاخی رسول کا قانون ہے اور اس کی سزا موت ہے۔

مسیحیت بھی کسی رسول، پیغمبر یا مقدس کتاب کے خلاف کہنے کے لئے نہیں کہتی بلکہ عزت و احترام کا سبق دیتی ہے۔ ہر مذہب اور تمام بنی نوع کے لئے پیار کا درس دیتی ہے۔ مگر یہاں C ۲۹۵ کے تحت اقلیتوں کو گستاخی رسول کے جھوٹے مقدمات میں ملوث کر رکھا ہے۔ اس وقت چوبیس مقدمات مسیحیوں کے خلاف درج ہیں۔ گل مسیح کو عدالت میں سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ جبکہ دیگر چار مقدمات میں نعمت احمر۔ بنتو مسیح۔ طاہر اقبال اور حال ہی میں منظور مسیح کو انتہائی سفاکی سے قتل کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ آج تک کسی عدالت میں توہین رسالت کا الزام ثابت نہیں ہو سکا۔

اس کے علاوہ بہت سے ایسے قوانین ہیں جن میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں تفریق کی جاتی ہے۔

۱۹۷۹ء کے حدود آرڈیننس کی رو سے شرعی قوانین کا اطلاق غیر مسلمانوں پر بھی ہوتا ہے۔

اتنا طول دیا گیا کہ وہ اور اس کے تین ساتھی رشتہ دار توہین رسالت کے جرم میں ملوث کر لیے گئے۔ ۵/اپریل ۱۹۹۴ء کی صبح کو عدالت میں پیشی تھی۔ سلامت مسیح رحمت مسیح اور منظور مسیح ملزمان کے طور پر عدالت میں پیش کیے گئے۔ عاصمہ جہانگیر مقدمہ کی وکیل تھیں۔ مقدمہ کی کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد یہ چاروں حضرات گوجرانوالہ واپس جانے کے لئے اے۔جی آفس کے پاس ویگن کا انتظار کر رہے تھے کہ موٹر سائیکل پر سوار دو دہشت گرد خودکار اسلحہ سے لیس آئے اور گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ سلامت، جان جوزف اور رحمت مسیح شدید زخمی ہوئے اور میو اور گنگارام ہسپتال لے جائے گئے لیکن منظور مسیح موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ تمام لاہور میں مسیحی حلقوں میں سناٹا چھا گیا کہ مسیحی اس ملک میں اس قدر غیر محفوظ ہیں۔ حالانکہ دیکھا جائے تو اس ملک کا کوئی باسی محفوظ نہیں۔ دوسرے دن تمام اخبارات میں منظور مسیح کے قتل کی شہ سرخی لگی۔

۷/اپریل کو منظور مسیح کا جنازہ کیتھیڈرل چرچ لارنس روڈ سے جیل روڈ گورا قبرستان تک مال روڈ سے پیدل چل کر کندھوں پر سوگواری کی حالت میں لے جایا گیا۔ تقریباً چھ ہزار مسیحیوں اور انسانی حقوق سے متعلقہ عوام نے جس میں بے شمار خواتین تھیں اس جنازہ میں شرکت کی۔ بشپ صاحبان میں سے الیگزینڈر جان ملک، جان جوزف، ارمانڈو ترنیڈاڈ، سموئیل پرویز، سموئیل عزرایاہ، جان سموئیل، بشیر جیون نے اور کئی دیگر پاسبانوں نے جنازہ کی رسم میں شرکت کی۔

لوگوں نے اشکبار آنکھوں سے منظور مسیح کے جسم کو قبر میں اُتارا۔

منظور مسیح کے قاتلوں کی گرفتاری کے لئے مسیحی عوام کی طرف سے ہڑتالوں، جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ بڑی دیر تک جاری رہا۔ مقدمہ تا حال زیرِ سماعت ہے۔

مذہبی تعصب رکھنے کی وجہ سے عدل و انصاف کی دھجیاں اڑا دی گئی ہیں۔ قانون اور انصاف کے دروازے بند کر دیے گئے ہیں۔ زنا بالجبر کے مقدمات میں غیر مسلم کی شہادت قابل قبول نہیں۔ اس قسم کے مقدمات کی پیروی بھی صرف مسلم وکیل ہی کر سکتا ہے۔ مسیحی نکاح کی بے حرمتی کے سلسلہ میں اقلیتوں نے کوشش کی مگر شنوائی نہ ہوئی۔ کتنا افسوس ہے کہ ایک مسیحی خاتون تو مسلمان ہو کر مسلمان کے نکاح میں آسکتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایک مسیحی نوجوان کے ایک مسلم عورت سے شادی کرنے کی سزا موت ہوگی۔

کیا یہ سچ نہیں کہ اس خطہ ارض میں قانون کی نظر میں ہم برابر نہیں اور نہ ہی ہمیں قانونی تحفظ حاصل ہے۔

۱۶۔ منظور مسیح کا بہیمانہ قتل ۵/اپریل ۱۹۹۴ء

قتل آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ انسانوں کو نہایت بے دردی سے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ قتل کا سلسلہ ایک نہایت ہی افسوسناک بات ہے۔ لیکن منظور مسیح کے قتل نے ایک لرزہ خیز داستان اور اس کے جنازہ نے رقت انگیز منظر پیش کیا۔ مذہبی رشتہ کی بنا پر ہر آنکھ ڈبڈبا آئی۔ ہر مسیحی دل تھام کر رہ گیا۔ ہر کوئی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگا۔

منظور مسیح کو ۵/اپریل ۱۹۹۴ء میں توہین رسالت میں ملوث کر کے قتل از انصاف شہید کر دیا گیا۔ اس کی قبر (واقع گورا قبرستان جیل روڈ لاہور) کو کیتھیڈرل ہائر سیکنڈری سکول لاہور کینٹ کے طلباء و طالبات اور سٹاف نے پختہ بنوایا ہے۔

سلامت مسیح ایک بارہ سالہ بچہ گوجرانوالہ کے قریب واقع گاؤں میں اپنے غریب والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ اسی گاؤں میں کبوتر اڑانے کے جھگڑے کو

منظور کا جنازہ لاہور کا ایک تاریخی اور سب سے بڑا ماتمی جلوس تھا اور یہ تو کلیسیائی تاریخ کا اور مذہب کی آڑ لے کر بنیاد پرستوں کا ایک گھناؤنا فعل تھا یہاں تک کہ انسانیت دم توڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ آخر خداوند یسوع کے الفاظ بھی تو حقیقت کو ثابت کریں گے۔

"میرے سبب سے لوگ تم کو لعن طعن کر جائے اور ستائیں گے اور ہر طرح کی بری باتیں تمہاری نسبت ناحق کہیں گے۔ لیکن میں دنیا کے آخر تک ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔ اے چھوٹے گلے نہ ڈر"۔

منظور مسیح کے قتل نے ایک دفعہ پھر تمام کلیسیاؤں، خادم الدینوں، سماجی کارکنوں اور عوام کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا۔ مسیحی جرائد اور رسالوں میں سے شاداب، کیتھولک نقیب، ساون اور جودت نے بڑی دلیری اور جرأت مندی کے ساتھ اس بے جواز قتل کی تشہیر کی اور حکومت سے انصاف طلب کیا۔ نیشنل کونسل آف چرچز اور انسانی حقوق کی انجمن نے اس سلسلہ میں بڑا فعال کردار ادا کیا۔

کلیسیا نے بشپ صاحبان اور خادم الدینوں کی قیادت کو اس آڑے اور مشکل وقت میں خوب سراہا۔ اس قتل کو دیکھنے والے ہر کس و ناکس کی ایک دعا تھی کہ خداوندا ایسا افسوسناک سانحہ جو مسیحی لوگوں کے دلوں کو بھینچ دے پھر بھی اس دھرتی پر دوبارہ نہ ہونے پائے۔

مسیحیوں پر ظلم کی داستان کو دیکھ کر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ منظور مسیح کے قاتل پاکستان کی عدالتوں سے تو بری ہو جائیں گے مگر خداوند کی عدالت سے کبھی فرار نہ ہو سکیں گے۔ وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔

اس ضمن میں یاد رہے کہ منظور مسیح کی قبر کی تعمیر کے لئے کیتھیڈرل ہائر سیکنڈری اسکول، عابد مجید روڈ، لاہور کینٹ کے مسیحی اساتذہ اور طلباء و طالبات نے

چندہ اکٹھا کیا۔ اس قبر کا پختہ کیا جانا ضروری تھا۔ کیونکہ قبر ایک بربریت کا نشان ہے۔ اس خون کا حساب ہے جو بلاوجہ مذہب کی آڑ لے کر بہایا گیا۔ یعنی مذہب رحیم کا مظہر ہے کہ وہ مقتول خداوند کے نام کا منکر نہ ہونے اور حق سے منحرف نہ ہونے پر حق سے کاربند رہا۔

مذکورہ قبر مسیحی اتحاد، وفاداری اور سوگواری کی ہمیشہ یادگار رہے گی اور اس کے کتبے کے الفاظ آنے والی نسلوں کو ان حقائق سے آگاہ رکھیں گے۔

باب دوازدہم

کلیسیا مُستقبل کے آئینہ میں

دورِ حاضر کی کلیسیا کو ترقی کی بہت سی منازل طے کرنی ہیں۔ مسیح خداوند نے جو کچھ بھی فرمایا وہ راست اور برحق ہے۔ کہ ''میرے سبب سے لوگ تم سے عداوت رکھیں گے''۔ ہمارے چہروں پر افسردگی طاری ہونے کی بجائے بشاشت کا نمایاں ہونا چاہیے۔ کیونکہ خداوند کا کلام سچ اور برحق ہے۔

مسیحی اس ملک میں اس احساس کے ساتھ رہتے ہیں کہ ہم دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ اکثریت آج بھی دیہات میں مکین ہے۔ جہاں پر ان کے لئے الگ [illegible] اپنا کنواں اور غیر مسیحی زمینداروں کی زمینوں پر دن رات محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالنا، ضروری اور اہم ضروریاتِ زندگی مثلاً شادی بیاہ اور مکان کی تعمیر کے لئے قرضے لینا اور پھر مدت مدید تک اس کی ادائیگی کرتے رہنا اُن کا نصیب ہے۔

اسی طرح بھٹوں پر اینٹیں بنانا، آگ میں پکانا ایسے کٹھن کاموں کا بوجھ بھی زیادہ تر مسیحیوں کے کندھوں پر ہے۔ بنی اسرائیل کا مصر میں رہنا اور ذلت اٹھانا اسی کی غمازی کرتا ہے۔

سندھ کے علاقہ میں بھی وہ ہندو اور شیڈول کاسٹ جو مسیحی ہو چکے ہیں آج بھی کسی بنیادی سہولت زندگی سے بہرہ ور نہیں۔ یہ چرچ ہی کی ذمہ داری میں شامل ہے کہ سماجی اور معاشی طور پر اُن کا خیال رکھے۔ پھر چرچ کو کچھ نہ کرنے کا طعنہ دینا محض ناشکری ہی نہیں بلکہ گناہ کے مترادف ہوگا۔ گویا یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ کلیسیا نے بہت کچھ کیا ہے مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

۱۸۵۰ء کے بعد وہ لوگ جنہوں نے کمترین ذات میں سے آ کر مسیحیت کو

قبول کیا نصف صدی سے زائد یعنی ۱۹۲۰ کی دہائی تک ان پڑھ اور پس ماندہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں برصغیر میں صدیوں تک دھتکارا جاتا رہا ہے۔ انہیں الگ تھلگ رکھا گیا۔ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے ان کو معیار زندگی اور سہولیات کے پاس نہ پھٹکنے دیا۔ اور ترقی کے دروازے ان پر بند رکھے۔ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ کلیسیاء نے حکومت سے کہیں بڑھ کر مسیحی عوام کی خدمت کی ہے۔ وہی لوگ جو ابتداء میں مسیحی ہوئے آج تک وہ تین ادوار اور پشتوں میں سے گزر چکے ہیں۔

اس ترقی کا ایک طائرانہ جائزہ یوں ہے۔

	مرد حضرات	خواتین
پہلی پشت:	لدھو، پھگو، لبھا، گھسیٹا وغیرہ	سنتی، بسو، برنا مو، ویرو وغیرہ
دوسری پشت:	برکت، فضل، رحمت، بشیر	برکتے، فضلاں، رحمتے، زینب
تیسری پشت:		
(اردو)	آشر، جاوید، سنیل، اصغر	آذرین، سنبل، سیما، نسرین
(انگریزی)	انتھونی، جسٹن، سوئیکل، ایزک	وکٹوریہ، الزبتھ، آسٹر، نورین،

ناموں کی تبدیلی اس حیرت انگیز ترقی کی مظہر ہے جو موجودہ دور میں آج سے ایک سو چالیس سال پہلے کی نسبت ہے۔ اس کی وجوہات ابتدائی مشنری اور کلیسیائی کارندوں کی محنت ہے۔

نئے گاؤں اور چکوک کی آبادی انہی نئی جگہوں پر سکولوں، ہاسٹل کا قائم ہونا اور تعلیم دینا اور پھر بڑے بڑے شہروں میں منتقلی اور نقل مکانی کرنا ترقی کا عمل ہے۔ مسیحی جو پشاور، فیصل آباد، راولپنڈی، لاہور، ملتان اور ساہیوال جیسے شہروں میں دیہاتوں کو چھوڑ کر آباد ہو گئے انہوں نے ان مسیحیوں کی نسبت جو دیہات میں رہے زیادہ ترقی کر لی۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک خاندان تھوڑا

[illegible] پڑھ گیا یا کسی تعلیم یافتہ ماحول کو اختیار کر کے انہوں نے اپنی آمدنی میں اضافہ کیا اور ترقی کرلی۔

وہ مسیحی جو دیہات میں پیچھے رہ گئے ہیں وہ دراصل وہاں سے نکلنے کے خواہشمند نہیں اس لئے ان کے لئے ترقی کے مواقع آج بھی بہت کم ہیں۔ وہ لوگ جو ان پڑھ اور پس ماندہ خاندان آگے چل رہی ہیں مستقبل میں پس ماندہ اور ان پڑھ ہی رہیں گے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسیحی ادارے ان لوگوں کو اس گھٹن اور [illegible] سے اپنی کوششوں کے بل بوتے پر نکالیں، بہتر مواقع فراہم کریں اور ترقی کا احساس بیدار کریں۔

۱۔ بڑے شہروں میں آباد مسیحیوں کے مسائل بھی بڑے ہیں۔ انگریزی راج کے بنائے ہوئے قبرستان ڈیڑھ صدی کے بعد ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ چند سالوں میں مردوں کا دفن کرنا ایک مسئلہ بن کر سامنے آئے گا۔ حکومت کو ایسے انتظامی معاملات میں اقلیتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

۲۔ ریڈیو۔ ٹیلی ویژن اور اخبارات میں اس بات کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے کہ اقلیتیں ہماری امانت ہیں۔ حالانکہ اقلیتوں کے لئے بنائے جانے والے قوانین میں اقلیتوں اور ان کے نمائندوں کو بھی مشورت اور اعتماد میں نہیں لیا جاتا۔

۳۔ عورت کی شہادت کو آدھی تسلیم کرنا یا بالکل تسلیم نہ کرنا غیر مسلموں کے ساتھ بے انصافی ہے۔ قصاص اور دیت کا قانون کسی صورت میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

۴۔ پاکستان میں جب بھی مردم شماری ہوئی تو مسیحیوں کی تعداد کو ہمیشہ صیغہ راز میں رکھا گیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق آج ان کی تعداد ساٹھ لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ کیا حکومت کا یہ فرض نہیں بنتا کہ وہ مسیحیوں کے صحیح اعداد و شمار

پیش کرے۔ اور مردم شماری کراتے وقت حکومتی نمائندوں کے ساتھ اقلیتی
ادارے بھی شامل ہوں تا کہ اس عمل میں غلطی کا امکان کم رہے"

۵۔ مسیحی تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا ہے لیکن سرکاری اداروں میں اور غیر مسیحی اداروں میں مسیحی بچوں کے لئے مسیحی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی بندوبست نہیں رکھا گیا۔ بلکہ شہریت اور اسلامیات جیسے مضامین پڑھنا یا رکھنا مجبوری بن جاتی ہے۔ کلیسیائی اکابرین نے انتہائی کوششیں کی ہیں کہ مسیحی بچوں کے لئے ایسا انتظام ہو سکے تا کہ اپنے مذہب سے آگاہی حاصل رہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اقلیتیں اس ملک میں بنیادی ضروری حقوق سے محروم ہیں۔ حکومت کو اس بات کی طرف بھی دھیان دینا چاہیے کہ جو مسیحی ادارے قومی تحویل میں لے لئے گئے وہ اپنا معیار، خصوصیت اور انداز کھو چکے ہیں۔ اور دن بدن پستی اور گراوٹ کا شکار ہو رہے ہیں۔

۶۔ حکومتی شعبوں میں ملازمتوں کے دروازے مسیحیوں پر بند ہیں۔ پیشہ وارانہ اداروں میں اقلیتوں کے لئے سیٹوں کا کوٹہ نہ رکھنے سے ان کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات میں انہیں اپنے خیالات کی ترجمانی کرنے کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔

ایسے گھمبیر مسائل ہیں جن کے لئے اقلیتوں کو، خاص طور پر مسیحیوں کو اس خطہ ارض میں ان تمام حقوق کے حصول کے لئے ایک طویل عرصہ تک جدوجہد کے ساتھ ساتھ وقت اور قربانی دینا ہوگی۔ ہم اسی خطہ کی پیداوار ہیں۔ نہ ہم غاصب ہیں اور نہ ہی غلام۔ اس کے باوجود ہمیں ہر روز احساس دلایا جاتا ہے کہ یہ ملک اسلامی ہے اقلیتوں کا نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ قانون کیوں بنتے۔ مذہبی کالم کا اندراج الگ کالم کیوں تجویز ہوتا۔ ملک میں برابر کے شہری ہوتے۔ ہمارا کام اس کے خلاف

آواز بلند کرتا ہے۔ ایک بار نہیں، نہ جانے کتنی بار اس کا اعادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا یہ جدوجہد بہت طویل ہوگی۔

تا حال جن باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ہمارے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل اور مشکل پہلو ہیں لیکن ایک نظر اگر کلیسیائی امور پر ڈالی جائے تو اچھا ہوگا۔

مسیحی قوم کی ترقی کا انحصار ایک گاڑی کے دو پہیوں پر رہا ہے۔ ایک حکومتی اور دوسرا کلیسیائی۔ اس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے کہ ترقی میں کلیسیائی ادارے اور کلیسیائی کردار زیادہ کارفرما اور فعال رہا ہے۔ مگر ان اداروں، گرجا گھروں اور کلیسیائی قیادت نے اس ضمن میں ناقابل برداشت دکھ اٹھائے اور قربانیاں دیں۔ مسیحی عوام کا ترقی یافتہ اور باشعور ہونا کلیسیائی اداروں اور مشنری خدمت ہی کا مرہون منت ہے۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے۔

گورڈن کالج، مرے کالج، سی۔ ٹی۔ آئی اور رائیونڈ انسٹی ٹیوٹ کی خدمات کو مسیحی عوام کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ ان اداروں اور کلیسیائی خدمات نے مسیحی نسلوں کی آبیاری کی ہے۔ اس کے بالمقابل حکومتی اداروں نے کیا فیض پہنچایا؟ اس کا موازنہ کرنا ایک ذی حس انسان کے لئے مشکل نہ ہوگا۔ یہ ادارے آج بھی مصروف عمل ہیں اور بفضل خدا رہیں گے۔

پرانی لیڈرشپ انہی اداروں سے ابھری مگر اب نئی لیڈرشپ کیتھیڈرل، اور کانونٹ طرز کے سکول فراہم کریں گے۔ اور ان اداروں کو اس چیلنج کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

آخر میں چند ایک باتوں کو پاکستان کی پوری کلیسیا کے روبرو لانا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی ان باتوں کو اپنا ذاتی فعل سمجھے تو غلطی کرے گا۔ یہ تصویر یا حالت

پوری پاکستانی کلیسیا کی ہے۔

اگر تمام مسیحی اور پوری کلیسیا اپنی تصویر دیکھ کر اپنی ترقی کرے تو ہم آنے والی نسلوں کے لئے خوبصورت نقش پا چھوڑ کر اس دنیا سے آرام کے ساتھ رخصت ہوسکیں گے۔

اس خیال کے ساتھ قدیم اسلاف کو سامنے رکھنا ہوگا۔ تامس جنز، جان نیوٹن، چارلس فورمین، اینڈریو گورڈن، تامس ویلپی فرنچ، آئی۔ ڈی شہباز اور آخر میں منظور مسیح جن کو فراموش کرنا مشکل ہوگا۔ امید واثق ہے کہ یہ تاریخ کے اوراق کی بدولت ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں تعلیم یافتہ مسیحی اس ملک سے ہجرت کر گئے بلکہ ۱۹۴۷ء ہی میں چلے گئے۔ اینگلو انڈین طبقہ نے بھی یہاں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ ہندوستانی تھے۔ جو کسی وقت موجودہ بھارت کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ نسل اور تعلیم کے لحاظ سے ترقی کر گئے تھے۔ انہوں نے بھی یہاں رہنا گوارا نہ کیا۔ چوتھے ہم تھے کیونکہ خدا کی مرضی یہ تھی کہ کلیسیا کا بقیہ یہاں بھی قائم رہے۔ اور شکر ہے کہ خداوند کی یہ مرضی تاحال قائم ہے اور رہے گی۔ ہمارا آب و دانہ یہیں کا ہے۔ اس حالت میں کلیسیائی اکابرین اور ذمہ دار حضرات کو خادم کی صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ حاکم نہ بنیں بلکہ زیادہ وقت نشستن، گفتن اور برخاستن میں گزارنے کی بجائے ڈرائنگ روم کے اندر کاموں کو اہمیت دینے، میٹنگز میں کئی کئی گھنٹے گزارنے اور خوشامد کو ترجیح دینے کی بجائے اپنے اصل مقصد پر بھرپور توجہ دیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ انجیلی تعلیم کے بالکل منافی ہے۔ ہمیں ہاں کی جگہ ہاں۔ نہیں کی جگہ نہیں، حق گوئی اور بےباکی کا جذبہ بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مخالفت کی

پالیسی اور روح کو نہ اپنانے کی خصوصیت کو سامنے رکھنا ہوگا۔ کیونکہ یہ پالیسی ...
قاتل ثابت ہوگی۔ خوشامد پسند آدمی اپنے کام میں بہت کم ماہر ہوتا ہے۔ اس میں
راستی اور وفاداری کا فقدان ہوتا ہے اور ''راستی کو بھول جانا روح کے جہاز کو
غرق کرنے کے مترادف ہے۔''

کلیسیا کا ایک اور گناہ یہ ہے کہ ذمہ دار لوگ حساب کتاب اور لین دین
میں بہت کم صادق نکلتے ہیں۔ خدا کا خادم کسی کی نیکنامی کو اپنی نہیں کہتا بلکہ اپنی نیکنامی
کو دوسرے کا نام دے کر خوشی محسوس کرتا ہے۔

کلیسیا میں لیڈرشپ کا ہمیشہ فقدان رہا ہے۔ خدا کے خادم کی ذمہ داری
زندگیوں کی تعمیر ہے نہ کہ تخریب کیونکہ اسے دوسروں کے لئے نمونہ بننا ہے۔ ہر شخص کو
اس دنیا اور مافیہا میں وقت پورا کر کے چلے جانا ہے۔ ہم اس طور سے دنیا سے
رخصت ہوں کہ آنے والی نسلیں ہماری زندگی کی تاریخ لکھ سکیں، ہمارے نقش قدم
پر چل کر استفادہ کر سکیں اور ہم اپنی تاریخ کے خود نوشت نہ ہوں۔ اس طرح شاید
حقائق کے ساتھ انصاف نہیں پردہ داری ہوگی۔

آج جب ہم کلیسیا کی تصویر دیکھنے کا ارادہ کر ہی چکے ہیں تو کیا یہ دیکھنا
اچھا نہ ہوگا کہ ہماری عبادتوں سے خداوند یسوع کا جلال کم اور ہمارا جلال اور
تشخص زیادہ مشتہر ہو رہا ہے۔ کیا ہماری ڈگریاں، ہماری تعلیم، ہمارا حسب ونسب،
ہماری پسند اور ناپسند اور ہماری قابلیت سب کچھ اپنے لئے نہیں؟ جو کہ صرف اور
صرف خداوند یسوع کے جلال کے لئے ہونی چاہیے۔ لیکن مایوسی میں امید کی کرن
متوقع ہے۔ اس لئے امید کا مدھم سا چراغ ابھی ٹمٹماتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے جو مستقبل
قریب میں پوری جگمگاہٹ کا مظاہرہ کرے گا یعنی

اس دنیا میں جب تک گلاب کی ٹہنی پر ایک بھی پھول کھلتا رہے گا۔

جب تک کسی معصوم بچے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہے گی۔

جب تک اس دھرتی کے آنگن سے گھاس کی ایک پتی بھی اگتی رہے گی۔

ہوا کا ہر جھونکا ہر آن یہ پیغام دیتا رہے گا کہ خدا ابھی تک انسانیت سے مایوس نہیں ہوا۔

ایم۔ کے گاندھی نے ایک موقع پر جو کہا اس کی تائید عظیم فلسفی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے یوں کی ہے۔

CHIRIST IS THE GREATEST SOURCE OF SRIRITUAL

STRENGTH

THAT MANKIND HAS EVER KNOWN

HE CAN GIVE EVERYTHING BUT ASKS FOR

NOTHING. CHRIST DOES

NOT BELONG TO CHRISTIANITY ONLY BUT TO THE

WHOLE WORLD.

ترجمہ:۔

یسوع وہ منبع ہے روحانی قوت کا

جس کا انسان کو کبھی علم ہوا

وہ سب کچھ دیتا ہے مگر لیتا کچھ نہیں

وہ صرف مسیحیت ہی کا نہیں بلکہ پوری دنیا کا ہے۔

پاکستان کی کلیسیا مسیح خداوند کی ہے اور ہم اس کے خادم ہیں۔

سانحہ شانتی نگر

سانحہ شانتی نگر ۵ رفروری ۱۹۹۷ء کو وقوع پذیر ہوا۔ چند شرپسند لوگوں نے اس علاقہ میں رہنے والے مسیحی لوگوں پر الزام لگایا۔ شانتی نگر اس علاقہ کا سب سے بڑا گاؤں ہے جس کی تقریباً تمام آبادی مسیحی لوگوں پر مشتمل ہے۔ جن کی اپنی زمینیں ہیں اور وہاں کے لوگ کاشتکاری کا کام کرتے ہیں۔ یہ گاؤں ایک عرصہ دراز تک سلویشن آرمی کے ماتحت رہا ہے اور یہ بڑا زرخیز علاقہ ہے۔ اپنی زمین کی زرخیزی کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ گاؤں خانیوال سے تقریباً ۱۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ شانتی نگر کے ساتھ ساتھ اور بھی چھوٹے چھوٹے مسیحی گاؤں آباد ہیں۔ جن میں نمبر شانتی نگر، (۸۱) اکیاسی چک، (۸۲) بیاسی چک، (۸۵) پچاسی چک، (۸۶) چھیاسی چک اور (۸۷) ستاسی چک وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ شرپسندوں نے تقریباً (۱۰) دس ہزار کی تعداد میں اکٹھے ہو کر ان چکوک پر بلہ بول دیا۔ جن میں خانیوال بھی شامل تھا۔ وہاں کے گھروں، اسکولوں، طبی مراکز اور خاص کر عبادت گاہوں (گرجا گھروں) اور شخصی جائیدادوں، جانوروں، اور یہاں تک کہ کھیتوں کو بھی نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔ خانیوال کی پولیس شرپسند عناصر کی کھلم کھلا مدد کرتی رہی۔ کچھ گھنٹوں کے بعد پاکستان آرمی نے حالات پر قابو پایا۔ لیکن اس وقت تک یہ تمام جگہیں یاس وحسرت کی تصویر بن چکی تھیں۔ مسیحان پاکستان نے (کراچی سے پشاور تک) بڑا جذبہ دکھایا۔ متاثرین کی بڑی مدد کی۔ بہت زیادہ روپیہ اکٹھا کیا گیا۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ایک دفعہ پھر اکٹھے ہو گئے۔ دنیا بھر کی حکومتوں نے اس اندوہناک واقعہ کی مذمت کی۔

حکومت پاکستان نے بھی وعدہ کیا کہ متاثرہ لوگوں اور جلے ہوئے گر
گھروں اور اسکولوں کی مرمت کا ذمہ لے گی اور حکومت پاکستان نے اس فرض کو

ایک خاص حد تک پورا بھی کیا۔ مولانا اجمل اور قاضی حسین احمد نے بھی اس
شرمناک واقعہ کی مذمت کی۔

خاص بات یہ ہے کہ ایسا واقعہ پاکستان کی کسی قوم کی تاریخ میں اس سے
پہلے کبھی رونما نہیں ہوا تھا۔

ختم شد